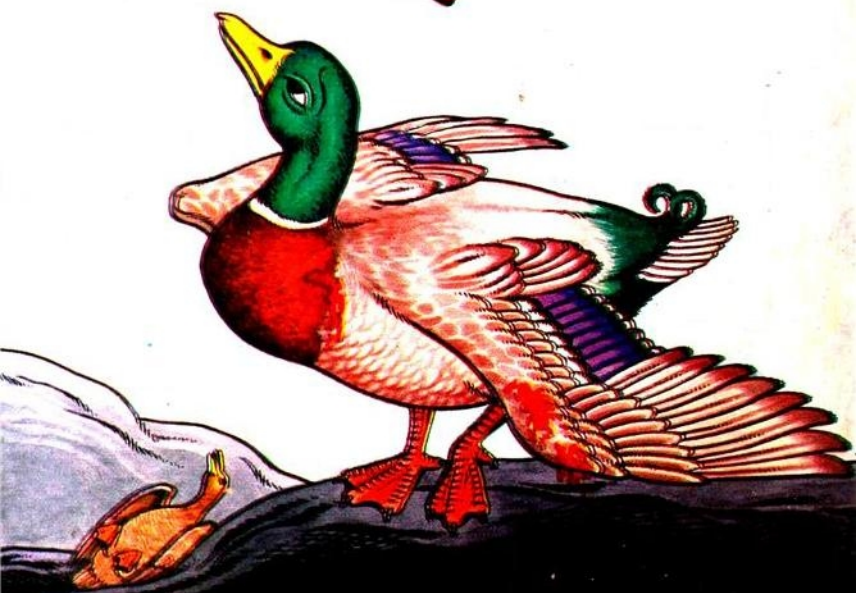

ڈار سے بچھڑے
سید محمد اشرف

ڈار سے بچھڑے

(افسانے)

سیّد محمّد اشرف

زیرِ اہتمام:

تخلیق کار پبلیشرز

۱۷۷۹، کوچہ دکھنی رائے، دریا گنج، نئی دہلی، ۱۱۰۰۰۲

آدمی

کھڑکی کے نیچے انھیں گزرتا ہوا دیکھتا رہا۔ پھر یکایک کھڑکی زور سے بند کی۔ مڑ کر پنکھے کا بٹن آن کیا۔ پھر پنکھے کا بٹن آف کیا۔ میز کے پاس کرسی پہ نک کر دھیمے سے بولا۔

"آج تو کل سے بھی زیادہ ہیں۔ روز بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔"

سرفراز نے ہتھیلیوں پر سے سر اٹھایا اور انوار کو دیکھا۔ "تم نے تو دو ہی دن دیکھا ہے نا، میں تو بہت دن سے دیکھ رہا ہوں۔ کھڑکی بند رکھوں تو گھٹن ہوتی ہے، کھول دوں تو دل اور زیادہ گھبراتا ہے۔ لگتا ہے جیسے سب ادھر ہی آ رہے ہوں۔" سرفراز چپ ہو گیا۔

پھر ایک لمحے کے بعد بولا۔

"آج تم سے اتنے برسوں کے بعد ملاقات ہوئی تھی تو دل کتنا خوش تھا کہ پھر یہ لوگ...

"میں نے تمہیں سفر کا واقعہ بھی تو بتایا تھا۔ میں بھی صرف دو ہی دن سے تھوڑے ہی دیکھ رہا ہوں۔ اُدھر گاؤں میں بھی آج کل یہی عالم ہے۔ کچھ اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کیا ہوگا۔"

سرفراز نے چاہت بھری نظروں سے اپنے بچپن کے ساتھی انوار کو دیکھا جس سے آج پندرہ سال بعد ملاقات ہوئی تھی۔

دونوں کی بہت ساری یادیں ایک سی تھیں.....

جب وہ بہت چھوٹا سا تھا تبھی اپنے خالو کے گھر پڑھنے بھیج دیا گیا تھا۔ خالو کا گھر ایک بڑے دیہات میں تھا جہاں سے دو میل کے فاصلے پر بسے قصبے میں انٹر کالج تھا۔ وہیں پہلے ہی دن ایک ہم عمر لڑکے نے بہت بے تکلفی کے ساتھ اس کی ربڑ لے کر اپنی آرٹ کی کاپی پر غبارے نما پھول بنا کر ایک لیمپ نما بلخ بنا کر اس کی ربڑ واپس کر دی تھی۔ حاضری کے وقت اس کا نام پکارا گیا تھا۔

"سید انوار علی"..... "حاضر جناب".....

گھڑی پر نظر ڈالی۔ صرف آدھا گھنٹہ رہ گیا تھا۔ صرف آدھا گھنٹہ... اُس نے دل ہی دل میں سوچا۔ سوچنے ہی سوچنے میں آدھا گھنٹہ بیت چکا ہے۔ یہ خیال آتے ہی وہ ہڑبڑا گیا۔ اس نے دل میں سوچا کہ بڑی مشکل سے اس قصباتی اسٹیشن پر یہ ایک گھنٹہ چرایا تھا۔ نہ جانے کیسے کیسے جتن کر کے ایک گھنٹہ کا وقت اس پر سکون ماحول میں میسر آیا تھا۔ اور اب اس میں سے بھی آدھ گھنٹہ رہ گیا ہے۔ میں کیا کروں، مجھے سکون کیسے ملیگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ آدھ گھنٹہ بھی گزر جائے اور میں سکون اور اطمینان سمیٹے بغیر پھر اس جگہ پہونچا دیا جاؤں جہاں سے سکون کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔

اسکی نظر چاروں طرف ناچنے لگی۔ یہ اسٹیشن بھی اور قصباتی اسٹیشنوں کی طرح پر سکون اور خاموش تھا۔ اس کے بائیں جانب ٹین کا شیڈ تھا جو لوہے کے ڈنڈوں پر ٹکا ہوا تھا۔ اور اسی شیڈ میں پکی اینٹوں کا بنا ہوا ایک کمرہ جس میں ایک میز اور چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک کرسی پر ایک سفید پوش آدمی بیٹھا رجسٹر کے صفحات گن رہا تھا یا شاید کچھ پڑھ رہا تھا۔ وہ صورت شکل اور اپنی مصروفیت سے اسٹیشن ماسٹر معلوم ہوتا تھا۔

سائبان سے ذرا ہٹ کر کُرتا دھوتی اور روئی کی بنڈی پہنے ایک خوانچہ والا امرود اور مونگ پھلی بیچتا نظر آیا۔ ایک مریل سا کتا جس کے جسم کو بھوک کھا گئی تھی بار بار اس خوانچہ کے پاس آتا اور وہ "مونگ پھلی اور امرود" کی آواز لگا کر پاس رکھی ہوئی چھڑی سے "ہش، ہش" کر کے اس کتے کو بھگا دیتا۔ اتنے اطمینان کے ساتھ جیسے اسے یقین کامل ہو کہ وہ کتا اس کے خوانچہ میں منہ نہیں ڈالے گا اور وہ کتا بھی اتنی بے فکری اور بے نیازی سے بار بار اسکے پاس آتا جیسے اسے یہ شبہ تک نہ ہو کہ چھڑی اس کے ماری بھی جا سکتی ہے۔ عجیب بے فکرا پن تھا اسکے انداز میں کوئی عجلت نہیں کوئی تیزی نہیں۔ سکون ہی سکون۔

"بابو جی، یہ لو نکٹ" بھرائی ہوئی آواز کے کھردرے ہاتھوں سے اس نے نکٹ لیا۔

گھڑی دیکھی۔ صرف دس منٹ رہ گئے ہیں۔ صرف دس منٹ۔ جس میں اسے اپنے متعلق کچھ سوچنا تھا۔ اپنے دل کو تھوڑا سکون دینا تھا۔

قوں۔ قوں۔ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ چبوترے پر لگے سگنل کے ڈنڈے پر ایک

پہاڑی کوا، پروں کو پھلائے، پوٹے پر سر رکھے بڑے اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا۔ اور جانے کیوں ایک لمحہ کیلئے اسے یہ خیال آیا کہ یہ کوا بھی اسکے شہر والوں سے بہتر ہے۔ کیونکہ اسے "قائیں، قائیں" بولنے کیلئے سوچنا نہیں پڑتا کہ کب اور کس جگہ مجھے بولنا ہے اور کب اور کہاں نہیں۔ اس کوّے کے انداز میں اسے ایک عجیب سی بے فکری اور لاابالی پن نظر آیا۔

پلیٹ فارم کے پکے چبوترے پر جامن کے درخت کھڑے تھے جن کے چاروں طرف اینٹ کے گھیرے بنادئے گئے تھے۔ ان اینٹ کے گھیروں پر بہت سے دیہاتی میلی دھوتیاں اور نئے کرتے پہنے ایک دوسرے کو پٹریاں بڑھا رہے تھے اور زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ کبھی کبھی بلند آوازوں میں ٹھٹھے لگانے لگتے اور سر پر بندھے انگوچھوں کو درست کرنے لگتے، گاڑی کے آنے کی انھیں شاید کوئی پرواہ ہی نہیں تھی۔ جانتے تھے کہ گاڑی آئے گی تو وہ ضرور جائیں گے۔

سامنے ریل کی پٹریوں پر جہاں جہاں سورج کی کرنیں پڑ رہی تھیں وہ حصہ خوب چمک رہا تھا اور اسے ایسا لگا جیسے لوہے کی پٹریوں میں چاندی کا جوڑ لگا دیا ہو۔

سامنے مال گاڑی کے ڈبوں پر درخت سر جھکائے کھڑے تھے۔ اور وہیں ایک چرواہا اپنی بھیڑوں کو چرا رہا تھا۔ اور وہیں اسی چرواہے کا بچہ، ایک بھیڑ کے بچے کو، ریشم کے گالے جیسے بچے کو گود میں اٹھائے چوم رہا تھا۔ اسکے ننھے ننھے، نرم اور سفید روئیں کو چوم کر ہاتھ ہلا ہلا کر اپنے باپ سے کچھ پوچھتا جا رہا تھا۔ اور اس چرواہے کے بچے کے چہرے پر اتنے پاکیزہ سکون کی رونق نکھری ہوئی جیسے صبحِ صادق کے وقت آسمان کی رنگت یا جیسے شبنم میں بھیگی چمیلی کی کچی کلیوں کی خوشبو۔ اور اس نے اپنے دل سے پوچھا کیا اسکی زندگی میں وہ ایک لمحہ کبھی نہیں آئے گا۔

"بابو! گاڑی آرہی ہے۔" قلی کے لال کپڑوں سے آگ کی لپٹیں نکلیں اور اسکی امیدوں اور ارمانوں کو بھسم کرتی چلی گئیں۔

"کیا... گاڑی آرہی ہے..... مگر وہ تو نہیں آیا....."

"کون نہیں آیا صاحب"؟

"کوئی نہیں۔ سامان اُٹھاؤ......"

اب وہ قلی کو کیا بتاتا کہ وہ لمحہ نہیں آیا جس کا اسے انتظار تھا۔ ریل دندناتی ہوئی آئی اور رک گئی۔ قلی نے اسکا سامان رکھا اور وہ گاڑی میں چڑھ گیا۔

اب گاڑی چلے گی اور پھر اسے اس جگہ پہونچا دیگی جہاں لوگوں نے سکون کا لفظ ایسے بھلا دیا ہے جیسے انسان چھوٹی چھوٹی غلطیاں کر کے بھلا دیتا ہے۔ اور اس نے سوچا کہ ایک گھنٹہ کی جو نعمت اسے ملی تھی وہ ویسی ہی رائگاں چلی گئی۔ اور سوچتے ہی سوچتے ایک گھنٹہ گزر گیا۔ گاڑی کے چلنے میں اتنی ہی دیر رہ گئی تھی جتنی دیر میں گارڈ کا جھنڈی والا ہاتھ اوپر اٹھے۔ اچانک وہ گاڑی سے کود پڑا۔

"گارڈ صاحب بس ایک منٹ۔ بس ایک منٹ کے لئے گاڑی روک لیجئے"۔ گارڈ نے جھنڈی والا ہاتھ نیچے رہنے دیا۔

سب سے پہلے اس نے خوب کھلے ہوئے، صاف، چمکتے ہوئے روشن آسمان کی طرف دیکھا۔ پھر خوانچہ والے اور اس کے کتے کی طرف دیکھا۔ سگنل پر بیٹھے کوّے کی طرف دیکھا جو گاڑی آنے پر اُڑ کر پھر بیٹھ گیا تھا۔ ان سب کی بے فکری اور سکون کو نگاہوں میں سمویا۔ اور پھر بڑی تیزی سے لائن پار کر کے اس چرواہے کے بچے سے بھیڑ کا بچہ جھپٹ کر اس کے ننھے ننھے، نرم اور سفید رونگٹوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اور ایک لمحہ کیلئے، صرف ایک لمحہ کے لئے اس نے آنکھیں بند کر کے یہ سوچا کہ وہ بھاگ دوڑ اور شور شرابے میں کام کرنے والا ایک کلرک نہیں بلکہ اس خوانچہ والے کی طرح، سگنل پر بیٹھے کوّے کی طرح، باقی مسافروں کی طرح اور اس چرواہے کے بچے کی طرح بالکل معصوم، بالکل بے فکر اور بالکل پرسکون آدمی ہے۔ وہ اس دندناتے، اُبلتے، کھولتے جیون کا ایک فرد نہیں بلکہ برف پوش پہاڑوں کی چوٹیوں کی طرح پرسکون اور سبزہ زاروں میں کھلے پھول کی طرح خوش ہے۔ اور اسی ایک لمحہ میں اسے ایسا لگا جیسے اس کے پھیپھڑوں میں تازہ اور خوشبودار ہوا بھر گئی ہو۔ اور اسی ایک لمحے میں اس کے چہرے پر اتنا سکون اور اتنا تقدس ابھر آیا جو سالہا سال ریاضت کرنے کے بعد بھی عبادت گزاروں کو میسر نہیں آتا۔

گاڑی چل پڑی..... اور وہ لپک کر گاڑی میں چڑھ گیا۔ اور خالی بنچ پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ اس ایک لمحہ میں اس نے کم از کم اتنا سکون اور اتنا لطف تو بھر لیا تھا کہ تھوڑی دیر بعد شروع ہونے والی افراتفری اور بھاگ دوڑ، شور شرابے کی زندگی میں اس ایک لمحہ کے تصور سے کچھ تو سکون پا سکتا ہے۔

کھڑکی کے باہر، ساتھ والی پٹریوں پر جہاں جہاں سورج کی کرنیں پڑ رہی تھیں وہ حصہ چمکتا ہوا ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ جیسے زنگ لگی، سیاہ، ریل کی پٹریوں میں کسی نے چاندی کا جوڑ لگا دیا ہو۔۔

سر پیچھے ٹیک کر، آنکھیں بند کر کے، وہ فولادی پہیوں کی گھڑ گھڑاہٹ سے اپنا ذہن ہم آہنگ کرنے لگا۔

○○

ڈار سے بچھڑے

ڈار سے بچھڑے

شروع جنوری کے آسمان میں ننھے ستاروں کی جگمگاہٹ کہرے کی موٹی تہہ میں کہیں کہیں جھلک رہی تھی۔ جیپ کی ہیڈلائٹس کی دو موٹی موٹی متوازی لکیریں آگے بڑھ رہی تھیں۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ سناٹے کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا یا پھر جیپ کے انجن کی آواز اور سڑک کے درختوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی سرگوشیاں... یکایک بھیگی ہوئی ہوا کے کئی جھونکے بند جیپ کے اندر گھس آئے۔ میں نے بندوق ٹانگوں پر رکھ کر شکاری کوٹ کی بیلٹ کو مزید کسا اور گردن کو مفلر سے اچھی طرح لپیٹ لیا۔ جیسے جیسے رات گزر رہی تھی، جاڑا تیز ہوتا جا رہا تھا۔ ہوائیں کچھ دیر کو تھمیں تو میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگائی۔

گاڑی لاہور کی حدوں سے بہت آگے نکل آئی تھی۔

"غلام علی!" میں ڈرائیور سے مخاطب ہوا۔

"جی حضور!"

"اور کتنی دور ہے شاہ گنج۔"

"بس صاحب تیس بتیس میل اور چلنا ہے۔"

"کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے پہنچنے سے پہلے چڑیا اٹھ جائے۔"

"کیا وقت ہوا ہوگا صاحب؟"..... اس نے جیپ کی رفتار تیز کرتے ہوئے پوچھا۔

میں نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور چنگاری کی روشنی میں گھڑی دیکھ لی۔

"ساڑھے چار ہو چکے۔"

"تب تو آپ بے فکر رہیئے۔ ساڑھے پانچ چھ تک پہنچ جائیں گے.... سات بجے کے قریب جا کر پو پھٹتی ہے.... چڑیا اس کے بعد ہی اٹھتی ہے۔"

پھر وہی سناٹا.....

"شاہ گنج سے تمھارا گھر کتنی دور ہے؟"

"شاہ گنج سے پہلے مغل بادشاہ کی بنوائی ایک مسجد سڑک کے کنارے پڑتی ہے۔ اس کے پیچھے سے ایک کچا راستہ جاتا ہے۔ ناک کی سیدھ دو میل چلیں تو ہمارا گاؤں نظر آجاتا ہے۔"

"کیا نام ہے تمھارے گاؤں کا؟" میں گفتگو کا سلسلہ جاری رکھنا چاہتا تھا۔

"خیراں والا۔"

کیا بات کروں اس پنجابی ڈرائیور سے.... پھر وہی خاموشی چھا گئی۔

سردیوں کی اندھیری رات کے پس منظر میں سڑک کے کنارے بوڑھے درختوں کے دُھندلے خطوط آہس میں مخلوط ہو گئے تھے اور کہرے کے غبار میں مل کر سناٹا اتنا گاڑھا ہو گیا تھا کہ میں جیپ سے باہر ہاتھ نکال کر اسے چھو سکتا تھا۔ سگریٹ کا آخری کش لے کر میں نے سگریٹ باہر اچھال دیا۔ بہت سی چنگاریاں ملگجے اندھیرے میں اِدھر اُدھر کھو گئیں۔

"صاحب آپ کو شکار کا شوق کب سے ہے؟"

"بچپن سے غلام علی۔"

"کیا ہندوستان میں شکار کھیلنے دیتے ہیں؟" گردن موڑے بغیر اس نے مجھ سے سوال کیا۔

"ہاں بھئی سینتالیس سے پہلے تو کھیلا جاتا تھا۔ اب نہیں معلوم۔ اور اب تو یہ بھی خبر نہیں کہ جن دیواروں کے بیچ ہم پلے تھے وہ ڈھے گئیں کہ سلامت ہیں۔"

"آپ تو یو پی کے تھے صاحب۔"

"ہوں۔" میں نے اسے دھیرے سے جواب دیا۔ میں نے چاہا کہ غلام علی سے منع کر دوں کہ ایسی کوئی بات نہ کرے کہ مجھے وہ سب کچھ یاد آجائے۔ لیکن میں چپ رہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی میری اس کمزوری کو جان سکے۔ ورنہ اے غلام علی یہ جو تم نے ابھی پوچھا تھا کہ آپ یو۔ پی کے تھے تو اس لفظ "تھے" پر میں تم سے گھنٹوں بحث کر سکتا ہوں۔ کیا پاکستان آنے کے بعد میرا اس خطۂ زمین سے کوئی ناطہ نہیں رہا جہاں میرے بچپن نے ممتا کی لوریاں سنی تھیں، جہاں میرے لڑکپن نے چھوٹے چھوٹے جذبوں سے محبت کرنا سیکھا تھا۔ جہاں میرے

عقل و ہوش کے بال و پر نکلے تھے۔

لیکن یہ سب کیسے کہتا.... یہ غلام علی کیا سمجھتا ان باتوں کو.... اور غلام علی ہی کیا اب تو میں خود بھی نہیں سمجھ پاتا اور سمجھتا بھی کیسے۔ تقسیم کی مونٹی مونی لکیروں کے نیچے ان سارے جذبوں کے نقوش چھپ گئے تھے۔ وہ جذبے جو صرف وہیں کا خاصہ ہوتے ہیں جہاں انسان پہلی بار آنکھ کھول کر دیکھتا ہے۔

ہوائیں مزید تیز ہو گئی تھیں اور کہرے کی چادر ویسی کی ویسی دبیز تھی۔

"تو صاحب آپ پھر کبھی ہندوستان نہیں گئے؟" غلام علی نے پوچھا تھا....

"سرکاری افسر اتنی آسانی سے نہیں جا پاتے، سرکار پوچھتی ہے کس سے ملنے جا رہے ہو۔"

"کیا کوئی رشتہ دار وہاں نہیں ہے؟"

"سب بزدل تھے یہاں آ بسے۔ میں بھی بزدل تھا لیکن چھوٹا بزدل۔ میری عمر اس وقت اٹھارہ سال تھی شاید۔ ہاں اٹھارہ ہی سال کا تھا میں۔"

"بزدلی کی کیا بات ہے صاحب، وہاں نہیں رہے یہاں آ گئے۔" غلام علی نے جیسے مجھے دلاسہ دیا۔ لیکن میں بھلا دلاسوں سے بہلتا!

"یہ بہت لمبا چوڑا فلسفہ ہے غلام علی۔ تم نہیں سمجھو گے۔"

وہ تھوڑی دیر خاموش رہا۔ جیسے میں نے اس کی بے عزتی کر دی ہو۔ "میری بیوی کے ماں باپ بھی بھارت ہی کے تھے صاحب۔ مجھ سے بہت ضد کرتی ہے کہ ایک بار ہندوستان دکھا دوں۔ میں نے درخواست دی تو پوچھا گیا کہ وہاں رشتہ داروں کے نام پتے لکھواؤ.... وہاں کوئی رشتہ دار ہی نہیں ہے صاحب۔ بس اسے اپنے گاؤں اور ضلع کا نام یاد ہے...."

سناٹا ہم دونوں پر خاموشی سے گزرتا رہا۔

"غلام علی۔" میں اس سے مخاطب ہوا۔

"جی!" اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔

"تمہاری بیوی کہاں کی رہنے والی تھی۔" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر سوال کیا۔

"ہردوئی ضلع کی صاحب۔"

"ہوں..... یو۔ پی کی ہے تمھاری بیوی؟"

"جی حضور۔" میں نے اندھیرے میں بھی محسوس کر لیا کہ وہ مسکرا رہا ہے۔

میں نے جان لیا تم اس وقت کیوں مسکرائے غلام علی۔

"صاحب ایک بات کہوں آپ سے۔ میری بیوی کو معلوم ہے کہ آپ یو۔ پی کے ہیں۔ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ تمھارا صاحب یو۔ پی کا ہے، میرے وطن کا، مجھے اس کے پاس لے چلو۔ وہ میرا پرمٹ بنوا دے گا..... تو حضور اسے معلوم ہے کہ آج آپ شکار کھیلنے آ رہے ہیں تو گھر پر بھی تھوڑا سا رکیں گے۔ وہ آپ سے کہے تو ذرا سختی سے منع کر دیجیے گا کہ اس کا پرمٹ نہیں بن سکتا۔"

"کیوں غلام علی ایسا کیوں کہوں میں۔ پاسپورٹ تو میں اس کا کسی نہ کسی طرح بنوا ہی سکتا ہوں۔"

"پاسپورٹ کی بات نہیں صاحب۔ آدمی کی زندگی میں ایک ہی جھنجھٹ تھوڑی ہوتا ہے۔ اسے تو بیکار کا شوق ہے بھارت جانے کا۔ اس کا شوق پورا کرنے میں میرے چار پان سو اٹھ جائیں گے۔"

"ہوں۔" میری سمجھ میں نہ آیا اسے کیا جواب دوں..... غلام علی نے میری خاموشی سے فائدہ اٹھایا۔

"صاحب میرا ایک دوست ہے وزیر الدین۔ اس کی بیوی بھی بھارت ہی میں پیدا ہوئی تھی۔ اس نے چوری چھپے پرمٹ بنوا لیا اور پھر کانوں کا زیور بیچ کر وزیر الدین سے اجازت مانگی۔ وزیر الدین کو معلوم ہوا تو اسے اچنبھا ہوا اور غصہ بھی آیا..... اس نے اوپری دل سے اجازت دے دی اور رات کو اس کے بکسے سے پرمٹ نکال کر جلا دیا۔ صبح اٹھی تو پرمٹ غائب۔ اس نے بڑا فیل مچایا اور وزیر الدین سے کہا کہ یہ اسی کا کام ہے۔ وزیر نے پہلے تو بہانے بنائے اور پھر صاحب ڈنڈا لے کر جٹ پڑا کہ حرامزادی تین چار مہینے تک کیا تیری اماں مجھے روٹی پکا کر کھلائے گی۔"

غلام علی نے سڑک سے نظریں موڑ کر میری طرف ایسے دیکھا جیسے اپنے دوست کی بہادری

اور دانش مندی کی داد چاہتا ہو۔

میں خاموش رہا..... اندھیرے میں وہ مجھے صاف صاف نہیں دیکھ سکا، سمجھا کہ میں بیٹھے بیٹھے سو گیا ہوں۔

اس نے میری طرف سے گردن موڑ کر سڑک کو دیکھا اور جیپ کی رفتار کچھ اور بڑھادی۔ رفتار بڑھی تو ہوا کچھ اور تیز محسوس ہونے لگی۔

مجھے ابھی ابھی یہ بھی محسوس ہوا کہ جیپ کے باہر سڑک پر اور درختوں پر ہوائیں بہت تیز ہو گئی ہیں..... اور درخت کے پتوں سے کچھ ایسی آوازیں پھوٹ رہی ہیں جو ماحول کو بے حد پراسرار بنادیتی ہیں۔ باہر کے اس پرشور ماحول میں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیپ میں بے پناہ خاموشی ہے۔ جیسے بپھری ہوئی موجوں کے سمندر میں کوئی اکیلا جہاز چلا جارہا ہو جس کے عملے کو بحری قزاقوں نے قتل کردیا ہو۔ میں نے بدن کچھ اور سکوڑ لیا اور سوچا.....

غلام علی..... تم بہت کمینے ہو اور بہت بھولے ہو..... تم اور تمھارا دوست نہیں جانتے کہ اس جگہ سے بچھڑ کر انسان کی کیا حالت ہوجاتی ہے جہاں اس نے پیدا ہو کر ماں کی چھاتیوں سے دودھ پیا ہو اور باپ کی شفیق انگلیوں کا لمس اپنے سر پر محسوس کیا ہو..... تمھیں نہیں معلوم کہ انسان کو وہ جگہ کتنی پیاری لگتی ہے جہاں اس کا بچپن لڑکپن سے گلے ملا ہو۔ تمھیں اس کا علم ہی نہیں غلام علی کہ انسان ان لمحوں کو کتنا عزیز رکھتا ہے جن لمحوں میں اس کا بھولا بھالا ذہن معصوم، سرپھرے اور خودسر جذبوں کو خون پلا پلا کر پالتا ہے۔ تم کچھ نہیں جانتے۔ کچھ بھی نہیں۔ اسٹیرنگ کا گول پہیہ گھماتے گھماتے تمھارا دماغ بھی گھوم گیا ہے۔

مجھے محسوس ہوا کہ اتنا سوچنے کے بعد مجھے ایکا ایکی غلام علی سے نفرت ہو گئی۔

میرے اندر سے کوئی بولا۔ تم غلام علی سے نفرت نہیں کررہے ہو۔ تم وہی کررہے ہو جو پچھلے تیس سال سے کرتے چلے آرہے ہو۔ تمھیں اپنی محرومیاں نظر آگئیں نا، تم غلام علی جیسے ہر اس فرد سے فوراً نفرت کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہو جو تمھاری محرومیوں کی عمارت میں ایک چھوٹی سی اینٹ رکھنے کا بھی خطاوار ہو..... اس بے چارے نے کیا کیا؟ صرف اپنی بیوی اور

سرفراز دھیرے سے بولا۔

"سید انوار علی"

"حاضر جناب۔ تمہیں اسکول یاد آرہا ہوگا۔"

"ہاں۔ تمہیں کیسے معلوم؟"

"یار تم اب بھی پہلے کی طرح گھامڑ باتیں کرتے ہو۔ میرا پورا نام حاضری کے وقت ڈرائنگ ماساب کے علاوہ اور کون پکارتا تھا۔"

سرفراز یہ سن کر مسکرایا حالاں کہ گھامڑ والا جملہ اسے برا لگا تھا لیکن وہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ آج میں افسر کی اونچی کرسی پہ بیٹھا ہوں۔ میرا بچپن کا یہ دوست پرائمری اسکول میں اردو ٹیچر ہے۔ اپنے احساس کمتری پہ قابو پانے کے لیے اسے ایسے ہی جملے بولنے چاہیے۔

پھر اس نے سوچا انوار ہی تو اسے اسکول سے واپسی پر حوصلہ دیتا تھا ورنہ قصبے سے دیہات تک پھیلے جنگل، سنسان باغوں اور خاموش کھیتوں میں ہو کر گزرنے میں اس کی روح آدھی رہ جاتی تھی۔ سرفراز نے سر کرسی کی پشت سے لگایا اور آنکھیں بند کر لیں اور بچپن کی اس دہشت کو یاد کیا اور اس یاد میں مزہ محسوس کیا۔

جاڑوں کے شروع میں چار بجے اسکول کی آخری گھنٹی بجتی۔ سب کے سب غل غپاڑہ کرتے تیزی سے نکلتے اور مست چال سے، بستے کندھے پہ ڈالے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے۔ سرفراز کے دیہات کا کوئی بھی لڑکا کالج پڑھنے نہیں آتا تھا۔ وہ راستے کی دہشت کے خیال سے سہما سہما، دھیرے دھیرے قدموں سے کالج کے گیٹ سے باہر نکلتا۔ انوار کبھی اس کے ساتھ ہوتا، کبھی نہیں ہوتا۔ جب ہوتا تھا تو تالاب تک چھوڑنے ضرور آتا تھا۔ تالاب سے آگے وہ بھی نہیں بڑھتا تھا کیوں کہ تالاب کے بعد سڑک مڑ گئی تھی اور موڑ کے بعد پیچھے دیکھنے پہ قصبہ غائب ہو جاتا تھا۔ رخصت ہوتے وقت وہ اس کی ہمت بڑھاتا تھا۔

"تم ڈرنا مت سرفراز۔ نہر کی پٹری پار کرو گے تو باغ میں داخل ہونے پر کوئی نہ کوئی آدمی مل ہی جائے گا۔"

سرفراز اس کی طرف بے بس نظروں سے دیکھتا اور اس خیال سے کہ انوار پر اس کا ڈر

اپنے دوست کی بیوی کے متعلق بتایا تھا۔ بس تھوڑی دیر کو انجانے میں یہ احساس دلا دیا یا یوں کہو کہ تمھیں یاد دلا دیا کہ تم ہندوستان کبھی نہیں جا سکتے۔ اس لیے تم اس سے نفرت کرنے لگے۔ اپنی محرومیوں کی آڑ لے کر اس بیچارے پہ کیوں بگڑ رہے ہو۔

میرا اندر والا بہت خود سر ہو گیا ہے کچھ عرصے سے ۶۵ اور ۷۱ کی لڑائیوں کے بعد تو یہ کچھ اور بھی بے باک ہو گیا ہے۔ ایسے ایسے سوال پوچھ بیٹھتا ہے کہ جواب نہیں بن پڑتے۔ جیسے موت کی سزا کا فیصلہ سننے کے بعد مجرم من مانی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ جانتا ہے کہ اس سے بڑی سزا ممکن نہیں ویسے ہی یہ بھی ہر خوف، ہر خطرے سے آزاد ہو گیا ہے۔ بلا سوچے سمجھے ہر بات کر گزرتا ہے۔ اب کیا جواب دوں اسے؟

مجھے محسوس ہوا کہ اب دماغ میں سوچنے کے لیے کچھ نہیں رہا۔ جیسے ذہن کے تالاب سے سوچ کی ساری مرغابیاں اُڑ گئی ہوں۔ میں نے سر پیچھے نکالیا۔

"صاحب۔" غلام علی نے دبی دبی آواز میں مجھے پکارا ..... اتنے دھیمے کہ اگر میں ذرا بھی نیند میں غافل ہوتا تو نہیں سن پاتا۔ شاید اس کا بھی یہی مقصد ہو۔

"ہوں..." میں نے محسوس کیا کہ میری آواز کچھ اجنبی سی ہو گئی ہے۔

"صاحب آپ سو گئے تھے کیا؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں..... کیوں کوئی خاص بات؟"

"نہیں حضور... ویسے آپ نے دیکھا جب سے لڑائی کے بعد راستے کھلے لوگ کتنے خوش خوش بھارت جا رہے ہیں اور وہاں والے کتنے ہنستے بولتے پاکستان آ رہے ہیں۔ ..... راستے کھلے کتنے ہی دن ہو گئے مگر اب تک تانتا سا لگا ہے۔"

خاموشی..... میں خاموش رہا جیسے ایک لفظ بھی بولا تو پھٹ پڑوں گا۔

"صاحب، او صاحب، آپ نے سنا میں نے کیا کہا؟"

میں نے چپکے سے گردن موڑ کر سڑک کو دیکھا جو پیچھے بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ بالکل تاریک اور سنسان.....

میں نے اندھیرے میں آنکھیں جما دیں اور سوچا.....

تم نے پھر اپنی کمینگی کا ثبوت دیا غلام علی۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ان راستوں کے کھلنے کا مجھ پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ میں اب بھی وہاں نہیں جا سکتا۔ تم جان بوجھ کر میرے زخموں کو کرید رہے ہو..............

غلام علی مجھ سے مایوس ہو کر ڈرائیو کرتا رہا۔

مجھے ابھی ابھی یہ خیال آیا کہ میں تو خیر ایسے عہدے پر فائز ہوں کہ ہندوستان جا ہی نہیں سکتا... لیکن غلام علی اور وزیرالدین کی بیویوں پر کیوں اتنی مجبوریاں لاد دی گئیں ہیں۔ انھیں اس سرزمین کو دیکھنے کی اجازت کیوں نہیں دی جاتی جس کے تصور کے بغیر ان کی زندگی کی تاریخ ادھوری ہے۔

غلام علی یہ جو تم خاموشی سے بیٹھے ڈرائیو کر رہے ہو تو اتنے بھولے تو نہیں ہو۔ تم سال میں مجھ سے تین مرتبہ چھٹیاں لے کر اپنے والدین سے ملنے کراچی تو جا سکتے ہو۔ ہردوئی نہیں جا سکتے۔ ہردوئی بھی تو لاہور سے اتنا ہی دور ہے جتنا کراچی ...... کیا کراچی جانے میں تمھارے پیسے نہیں خرچ ہوتے۔ کیا کراچی کا ٹکٹ مفت ملتا ہے۔ لیکن میں تم سے یہ سوال کیوں پوچھوں۔ مجھے کیا حق ہے اور مجھے تو یہ پوچھنے کا بھی حق نہیں ہے کہ تمھارا دوست وزیرالدین کیا تین چار مہینے ہوٹل کی روٹی نہیں کھا سکتا کہ ان تین چار مہینوں میں اس کی بیوی تیس برسوں کی محرومی کے بعد اس آب و ہوا میں جا کر سانسیں لے سکتی ہے جہاں اس نے اپنے بچپن کو تھپکیاں دے کر سلایا تھا۔ جوانی کو آگے بڑھ کر خوش آمدید کہا تھا۔ مجھے ان سوالوں کے پوچھنے کا حق اس لیے اور بھی نہیں ہے غلام علی کہ سوال وہ پوچھتے ہیں جن کو جواب نہیں معلوم ہوتے۔ میں تیس سال سے سوالات تخلیق کر کے جوابات گڑھ رہا ہوں۔ میں اس معاملے کی ہر نزاکت سے واقف ہو گیا ہوں .... لیکن ہر جواب ادھورا ہے غلام علی کیوں کہ جس دن میں نے خود کو صحیح جواب دے دیا اس دن یہ سوال کرنے کا مشغلہ بھی ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ غلام علی کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک بھیانک جواب میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ میں فوراً کوئی ٹیڑھا سا سوال کر دیتا ہوں۔ اور تب تک سوالات کرتا رہتا ہوں جب تک وہ خوف ناک جواب مبہم ہو کر .... میری نظروں سے اوجھل نہ

ہو جائے۔ مجھے بہت خوف آتا ہے صبح جوابوں سے.....

"صاحب مسجد آ رہی ہے۔" غلام نے مجھے بتایا..... "ابھی پو پھٹنے میں بہت دیر ہے۔ میرے گھر چلنا پڑے گا آپ کو۔ نہیں تو جمیلہ غم کرے گی..."

"ٹھیک ہے، وقت ہو تو ضرور چلو۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم پہلے تالاب پر جائیں پھر تمھارے گھر جائیں۔"

جیپ ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی... ہوائیں جو چلتی ہوئی گاڑی میں بہت پرشور اور ٹھنڈی تھیں ایکا ایکی مدھم پڑ گئیں۔

سڑک کے بائیں طرف وسیع اندھیروں کے پس منظر میں، کہرے میں لپٹے ہوئے مجھے ایک مسجد کے دھندلے خطوط نظر آئے۔ مسجد سے ذرا ہٹ کر ایک الاؤ جل رہا تھا اور اس کے گرد تین آدمی کھڑے تھے۔ اتنے حصے کے اندھیرے کو الاؤ نے نگل لیا تھا اور ان آدمیوں کے گرد ایک روشن حلقہ کھنچ گیا تھا.... میں نے غور سے دیکھا۔ دو آدمیوں کے کندھوں پر بندوقیں لٹکی ہوئی تھیں..... جیپ رُکنے پر وہ ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

غلام علی بڑ بڑاتا ہوا نیچے اُتر آیا.....

میں سمجھ گیا غلام علی کیوں بڑ بڑایا۔ دوسرے شکاریوں کو دیکھ کر وہ ہمیشہ ایسے ہی ناراض ہو جاتا ہے.....

بندوق ہاتھ میں سنبھالے میں نیچے اُتر آیا.... ٹھنڈی ہوائیں میرے کپڑوں میں گھس گئیں اور کہرے کی نمی کو میں نے اپنے چہرے پر محسوس کیا۔ ان آدمیوں نے ایک طرف سمٹ کر الاؤ کے قریب جگہ بنائی جیسے مجھے خاموش دعوت دے رہے ہوں..... غلام علی کو پیچھے آنے کا اشارہ کر کے میں الاؤ کی طرف بڑھ گیا۔

ان کی جیپ بھی قریب ہی اندھیرے میں کھڑی ہوئی تھی۔ ان میں ایک ڈرائیور کی وردی پہنے ہوئے تھا اور دو شکاری کوٹ لادے ہوئے تھے..... الاؤ کے قریب دیر سے کھڑے رہنے کے باعث ان کے چہرے پر پسینہ پھوٹ آیا تھا..... ان میں ایک صورت مجھے جانی پہچانی سی لگی۔ حافظے کی غیر مرئی لہروں پر ایک چہرہ تھرتھرا رہا تھا۔ لیکن وہ صورت اتنی

مبہم اور غیر واضح تھی جیسے پرائمری اسکول کے زمانے کی لکھی ہوئی کلاس کی کاپیاں، جو بڑے ہونے کے بعد پہچانی بھی نہ جاسکیں اور بھلائی بھی نہ جاسکیں..... الاؤ کی سرخ آنچ میں وہ چہرہ دہک رہا تھا۔ وہ صورت مجھے پھر جانی پہچانی لگی.... وہ شخص بھی مجھے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ .... میں نے اس کے چہرے پر آنکھیں گاڑ دیں۔ اس نے اپنے ہاتھ الاؤ کے سامنے گرم کیے اور انھیں گالوں پر رکھ لیا.... یادوں کی آنچ سے حافظے پر جمی ہوئی برف پگھلی اور میرے ذہن میں ماضی کے آئینہ خانے سج گئے۔ میں نے اس ایک لمحے میں تیس برس کا سفر طے کر لیا اور اتنی خاموشی سے یہ سفر کیا کہ مجھے محسوس ہی نہیں ہوا کہ کب میں یہاں سے وہاں پہنچ گیا.... میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سی بجلیاں چمکیں اور بہت سے خاکے بن گئے اور ان خاکوں میں میرے حافظے نے بڑی سبک دستی سے بچپن کی امنگوں، لڑکپن کی جستجو اور شروع جوانی کے ولولوں کے بے حد خوشنما رنگ بھر دیے۔ میں نے یوپی کے گنگا جمنا کے دوآبے میں بسے اس قصبے کو بالکل واضح شکل و صورت میں اپنے ذہن کے پردے پر چمکتا ہوا دیکھا.... وہاں کی مسجدیں دیکھیں، وہاں کے مندر دیکھے.... وہاں کے سارے محلے ساری گلیاں، دیکھ ڈالیں۔ قصبے کے سارے کچے پکے گھر دیکھ ڈالے۔ اپنا مکتب دیکھا، پھر اسکول دیکھا۔ سارے بزرگ اور تمام ماسٹر شفیق چہرے لیے اپنے سامنے کھڑے دیکھے۔ میلوں کی دھوم دھام دیکھی اور دیہات کی جوان اور خوبصورت عورتوں کو نیلے پیلے اور سرخ گھاگھروں میں ہنستے بولتے میلے کی طرف بڑھتے دیکھا.... گیہوں کے کھیتوں کے طویل سلسلے دیکھے اور دور دور تک آم کے باغ بور میں لدے ہوئے نظر آئے۔

اس ایک لمحے میں بچپن کی ساری شرارتیں نظر آگئیں۔ مئی جون کے تپتے ہوئے موسم میں سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے اپنے آپ کو دیکھ لیا.... گرم لو سے اپنا بدن جھلستے ہوئے دیکھ لیا۔ اپنے سارے عزیز قطار اندر قطار کھڑے نظر آئے۔ کچھ ان میں وہیں سو گئے اور جو باقی رہ گئے تھے وہ اب صرف رشتہ دار رہ گئے تھے، عزیز نہیں۔

آئینہ خانے میں ایک عکس اور چمکا.... دو لڑکے ہاتھوں میں ایئر رائفل لیے چلے جا رہے ہیں۔ سورج جھک آیا ہے اور دن بھر کی حدت اب صرف زرد روشنی بن کر رہ گئی ہے۔ پیڑ کے

باغ میں تیتر بول رہے ہیں.... ان لڑکوں میں سے ایک پیر کے باغ میں گھس گیا ہے اور دس منٹ بعد جب باہر آیا تو فاتحانہ انداز میں ہاتھ میں لٹکے بھورے تیتر کو دکھا رہا ہے۔ دوسرا لڑکا جو ہاتھ پیچھے کیے کھڑا تھا ہاتھ آگے کر دیتا ہے جس میں ایک ذبح کیا ہوا خرگوش الٹا لٹکا ہوا تھا۔ دونوں ہنس پڑتے ہیں، دونوں نے اپنے اپنے حصے کا شکار کر لیا تھا.... پھر ایک عکس اور سامنے آیا.... اب یہ لڑکے کچھ اور بڑے ہو گئے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں ایئر رائفل کی جگہ بندوقیں آ گئی ہیں.... رمضان میں سحری کا ناشتہ کرنے کے بعد یہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ آبی چڑیوں کے شکار کو جا رہے ہیں۔ دوپہر کو روزہ توڑنے کے لیے ماؤں نے تھیلوں میں افطار کا سامان بھر دیا ہے۔ پوس کی چاندنی رات میں برفیلی ہواؤں سے بدن بچاتا ہوا یہ قافلہ بڑھتا چلا جا رہا ہے.... فضا میں سائیں سائیں کی آوازیں مستط ہیں۔ سب دل ہی دل میں تمنا کر رہے ہیں کہ سب سے زیادہ چڑیاں میرے ہاتھ سے شکار ہوں.... اس بات پر سب بے حد خوش ہیں کہ گھر والوں کو بے وقوف بنا کر روزہ گول کر دیا ہے۔ اب یہ قافلہ نہر کی پٹری سے اتر کر تالاب کی طرف بڑھ رہا ہے۔ تالاب سے دو فرلانگ دور بیٹھ کر اسکیم بنائی جا رہی ہے کہ کہاں سے کسے فائر کرنا ہے.... یہ اندازہ لگایا جا رہا ہے کہ چڑیا تالاب کے کس حصے میں ہوگی۔ .... اندھیرا چھٹنا، پو پھٹنی، سورج نے کہرے کا مفلر اتار کر چہرہ دکھایا تو معلوم ہوا کہ تالاب بالکل چاندی جیسا پڑا ہے۔ سب ایک دوسرے پر ملامت کر رہے ہیں اور توجیہہ پیش کر رہے ہیں کہ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ چڑیاں نہیں صرف سارس بول رہے ہیں۔ پھر فاختاؤں اور بگلوں جیسے بہترین پرندوں کو چن چن کر مارا جا رہا ہے۔ سہ پہر کو لوٹتے وقت مٹی کے ڈھیلوں سے رگڑ رگڑ کر ہونٹوں کو خشک کیا جا رہا ہے تاکہ گھر والے جان نہ پائیں روزہ بھی ذبح کر دیا ہے۔ راستے میں تھکن کی وجہ سے گفتگو کرنا تک محال ہو رہا ہے۔ لڑکپن کی کچی ہڈیوں پر جسم کا بوجھ سنبھالے گھر کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔ سامنے بستی کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔ دور سے قصبے کی دھندلی سرحدوں پر مسجدوں کے سیاہ کائی زدہ گنبد اور مینار خاموش کھڑے ہیں۔ کسی کو اچانک یاد آ گیا اور فاختاؤں اور بگلوں کے پر ادھیڑ دیے گئے تاکہ جب یہ گھر میں داخل ہوں تو ہریل اور بڑے چھوں کی حیثیت سے ان کا استقبال کیا جائے۔

ایک کے بعد ایک ایسے ہی بہت سے عکس نظروں کے سامنے چھما کے مارتے ہوئے گزر گئے۔ جن میں بچپن سے لے کر شروع جوانی تک سارے منظر تھے اور ہر منظر میں دونوں لڑکے ساتھ ساتھ ہیں۔

"صاحب.... اب چلیے گاؤں کی طرف...." آئینہ خانوں میں غلام علی کی آواز نے پتھر مارا اور سارے آئینے چٹخ کے ٹوٹ گئے۔ سارے مناظر آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔

میں نے غلام علی کی بات کا جواب نہیں دیا۔ میں نے حساب لگایا کہ یادوں کی کتنی چڑیاں ابھی میرے ذہن کے پنجرے میں بند ہیں اور سامنے کھڑا یہ شکاری میری کتنی یادوں کا حاصل جمع ہے۔

اس نے پھر ہاتھوں کو گرم کر کے چہرے پر رکھا۔ نواب بھی تو ایسا ہی کرتا تھا۔ اور اب مجھے یقین کامل تھا کہ آئینہ خانے کا وہ لڑکا اپنی عمر میں ایک دم تیس برس جوڑ کر میرے سامنے کھڑا ہے۔

یکایک ہوا بالکل خاموش ہو گئی.... الاؤ میں جلتی ہوئی درختوں کی ٹہنیاں چٹاچٹ بولیں، چنگاریاں فضا میں اڑنے لگیں۔ دور کسی سوئے ہوئے تالاب میں کوئی سارس زور سے چیخا.... میں نے آہستگی سے الاؤ کی طرف ایک قدم بڑھایا اور اس شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"آپ.... تم.... تم نواب ہو...."

اس کی پھیلی ہوئی آنکھیں ایک ثانیہ کو سکڑ گئیں۔ اس کا سر نفی میں ہلا۔ اس کی آنکھوں سے اتنے آنسو بہے کہ چہرے کے پسینے کو بھی بہالے گئے.... جذبوں کی شدت اور آنچ کی حدت سے اس کا چہرہ انگارہ ہو گیا.... اس نے بندوق کندھے سے اتار کر اپنے ساتھی کو تھمائی اور الاؤ کا پورا چکر کاٹ کر میرے قریب آیا اور میرے گلے سے لپٹ کر خاموش ہو گیا۔

"اب تم ہرگز مت بتانا کہ تم کون ہو۔" تیس سال کے بعد میں نے وہ آواز سنی جو لگاتار سولہ سترہ سال تک سنی تھی۔

"نہیں میں نہیں بتاؤں گا کہ میں کون ہوں".... میں نے اسے مضبوطی سے تھام لیا۔ خدا

جانے کب تک ہم یوں ہی کھڑے رہے.... الاؤ کی آگ، ھم پڑنے لگی اور پتوں کی راکھ ہوا میں بکھر گئی۔

کہرا آہستہ آہستہ چھٹ رہا تھا.... غلام علی اور اس کے دونوں ساتھی بت بنے حیرتی کھڑے ہمیں تکتے رہے.... محبت کا ایک عالم ہم پر گزر رہا تھا.... جب ایک عرصہ بیت گیا تو میں نے اس کا سر ہاتھوں میں تھام کر پینتالیس چھیالیس برس کے اس پندرہ سالہ لڑکے کی پیشانی کو چوم لیا۔

"غلام علی اب اتنا وقت نہیں ہے کہ تمھارے گھر جایا جاسکے۔ ایک بار تالاب پر ہولیں، پھر چلیں گے تمھارے گھر...."

میں نے نواب کو بتایا کہ یہ میرا ڈرائیور غلام علی ہے۔ غلام علی نے اسے جھک کر بندگی کی۔

نواب نے بتایا کہ ایک اس کا ڈرائیور ہے اور دوسرا اس کی فیکٹری کا منیجر سلیم اللہ.... میں نے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا.... وہ تیس بتیس برس کا ایک خوش رو نوجوان تھا.... جیپیں شاہ گنج کے تالاب کی طرف موڑ دی گئیں۔

نواب مجھے بتا رہا تھا کہ ہندوستان سے آکر اس نے کیسے کیسے پاپڑ بیلے اور کس طرح پلاسٹک کی چپلوں کی یہ فیکٹری لگا سکا.... اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ابھی اسے پچھلے دنوں یہ معلوم ہوا تھا کہ میں سپرنٹنڈنٹ پولیس ہو گیا ہوں اور میرا تبادلہ لاہور میں ہوا ہے۔

"تم مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے پھر؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"مجھے یقین نہیں تھا کہ واقعی تم ہی ہو گے۔ بس نام سنا تھا۔"

وہ مجھے بتا رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ شخصیتیں کتنی بے نشان ہو گئی ہیں کہ نام موجود ہونے کے باوجود نہیں پہچانی جاتیں.... لیکن اس میں اکیلے نواب کا دوش نہیں ہے۔ میں بھی تو اخباروں میں "نواب اینڈ سنس" کا اشتہار دیکھ کر چونکا تھا.... لیکن پھر یہ سوچ کر چپ ہو رہا تھا کہ کیا خبر یہ کوئی اور نواب ہو.... ہم سب ایک سے گنہگار ہیں۔ ہمیں ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم ایک دوسرے پر الزام لگائیں۔

"تم کراچی سے کیا شکار کھیلنے آئے ہو صرف؟" میں نے اس سے پوچھا....

"نہیں بھئی.... فیکٹری کے کام سے لاہور آیا تھا.... پلین کا ٹکٹ کل کا ہے۔ سوچا ایک دن ملا ہے شکار کھیل لوں۔"

جیپ کے باہر گیہوں کے سلسلے دور دور تک چلے گئے تھے۔ اور ان کھیتوں کے پرے غیر واضح درختوں کی آڑ میں صبح کاذب دم توڑ رہی تھی اور صبح صادق کی دھندلی دھندلی چمک درختوں کے پس منظر میں آہستہ آہستہ نکھر رہی تھی.... آسمان پر بہت سی بھیڑیں چر رہی تھیں۔ قائیں قائیں کی گھٹی گھٹی آوازوں سے اس بات کا اندازہ ہو رہا تھا کہ ہم کسی تالاب کے قریب ہیں۔ میں نے سامنے دیکھا۔ ایکھ کے کھیتوں کے ادھر مٹیالے اجالے میں دور دور تک پانی چمک رہا تھا لیکن یہ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ چڑیا تالاب کے کس حصے میں ہے۔ تھوڑا اجالا اور ہو تو چڑیا کی موجودگی کا اندازہ کیا جا سکے۔

غلام علی نے جیپ روک دی....

"حضور اس سے آگے گاڑی گئی تو چڑیا انجن کی آواز سے بھڑک جائے گی....

"ظاہر ہے" کہتا ہوا نواب نیچے کود گیا.... میں بھی اتر آیا۔

ابھی ابھی اترتے وقت میں نے سوچا کہ آج تیس سال کے بعد نواب میرے ساتھ ہے۔ آج بھی کہیں ایسا نہ ہو کہ سورج نکلے تو معلوم ہو کہ چڑیا تالاب میں ہے ہی نہیں.... میں نے محسوس کیا کہ یہ سوچتے وقت میں بے ساختہ مسکرا اٹھا ہوں....

"سنو".... نواب نے مجھے مخاطب کیا۔ "تمھیں یاد ہے ایک بار جب ہم لوگ تالاب پر گئے تھے تو تالاب نے کیسا دھوکا دیا تھا.... اُجالا ہونے پر معلوم ہوا تھا کہ جن آوازوں کو ہم چڑیا کی آواز سمجھ رہے ہیں وہ چڑیا نہیں بلکہ".... وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا.... اس نے میری طرف غور سے دیکھا۔ بہت غور سے.... شاید اسے علم ہو گیا تھا کہ میں بھی وہی سوچ رہا ہوں جو وہ سوچ رہا تھا۔

اس نے مفلر سے اپنی گردن کو اچھی طرح ڈھکا۔ اور بندوق میں کارتوس لگا کر میرے بہت قریب آ کر پراسرار انداز سے سرگوشیوں میں پوچھا.....

"کیا تمھیں بھی وہی یاد آ رہا تھا اس وقت؟"

میں نے آہستہ سے گردن ہلادی۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہم دونوں کو اچانک اپنی محرومیوں کا احساس ہوا ہے۔ بے محابا۔ ڈھیٹ اور وحشی یادیں پھر میرے دماغ میں چاند ماری کرنے لگیں۔

دوسری جیپ پیچھے آکر رکی۔ سلیم اللہ بندوق لے کر نیچے اُتر آیا۔

"چڑیا تو کافی بول رہی ہے"۔ اس نے دھندلے دھندلے تالاب پر نظریں جما کر کہا۔

غلام علی ایکھ کے کونے پر گیا۔ اور تھوڑی دیر تک چڑیا کی آواز سے اندازہ کرتا رہا کہ کس جگہ بول رہی ہے اور پھر واپس آگیا۔

"ویسے صاحب یہ بڑا تالاب ہے۔ دن بھر چڑیا پڑی رہتی ہے لیکن صبح کی ہون میں زیادہ ہوتی ہے اور غافل بھی ہوتی ہے۔ اسی وقت تو یہ چارا کھاتی ہے۔" غلام علی نے اپنی معلومات سے ہمیں مستفیض کیا۔

میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ تالاب کے اس کنارے پر سیاہی مائل گدلے آسمان میں روشن پھنکیاں پڑنے لگی تھیں اب کسی بھی وقت فائر ہو سکتا تھا..... ہم لوگوں نے فوراً اپنی اپنی جگہ منتخب کرلی۔ میں اور نواب جوتوں سمیت کیچڑ میں گھس گئے اور گھٹنوں گھٹنوں پانی میں پہنچ کر ایک اونچی منڈیر پر بیٹھ گئے جو تین طرف سے ایکھ سے گھری ہوئی تھی۔ سلیم اللہ بندوق لے کر آگے بڑھ گیا اور غلام علی اپنی ایک نالی سنبھالے ہوئے تالاب کے دوسرے سرے پر چلا گیا۔

ہم دونوں اس منڈیر پر خاموش بیٹھے رہے۔ جب تک کہرا چھٹ نہ جائے کسی قسم کی نقل و حرکت سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سورج نکلنے کے بعد فائر ہو سکتا تھا۔ آسمان کے مشرقی گوشے میں لمبے لمبے گلابی لہریے پڑنے لگے تھے..... سورج نکلنے ہی والا تھا۔

"یہ سلیم اللہ بندوق کیسی چلاتا ہے؟" میں نے سگریٹ سلگا کر پوچھا۔

"بہت عمدہ..... اچھا خاصا شکاری ہے۔" نواب نے میرے ہاتھ سے پیکٹ لیتے ہوئے بتایا۔

یکایک تالاب کے دوسرے کنارے پر سارس زور زور سے بولے اور چڑیا کی تیز تیز سرگوشیاں بند ہو گئیں..... شاید چڑیا کو شبہ ہو گیا تھا۔

میں نے بندوق میں کارتوس لگا لیے۔

"نواب۔" میں نے اسے دھیرے سے پکارا۔

"ہاں" اس نے میری طرف دیکھا۔

میں خاموش رہا۔

"کیا بات ہے کچھ کہہ رہے تھے تم؟"

"ہاں..... میں کہہ رہا تھا کہ کیا پاکستان آنے کے بعد کبھی دل نہیں چاہا کہ گھر واپس جاؤ۔"

بڑا بھیانک سناٹا تھا جو ہم دونوں کے درمیان منہ پھاڑے بیٹھا تھا..... وہ بالکل خاموش رہا..... مجھے یہ محسوس ہوا کہ سارس کی آوازیں سیکڑوں میل دور سے آ رہی ہیں، تالاب کا پانی ساکت ہو گیا ہے اور صبح کی تیز ہوائیں بالکل چپ ہو گئی ہیں۔

میں نے سوچا..... نواب، تم گھبرا گئے..... واقعی بڑا تلخ سوال پوچھ لیا میں نے۔ لیکن مجھے اس کا بھی احساس ہے کہ اس کا جواب ان تلخیوں کو اور بوجھل کر دے گا..... لیکن مجھے اس کا جواب چاہیے۔ میں تو خیر مجبور ہوں..... تمھارے آگے کون سی رکاوٹ تھی..... وہاں کی گلیاں، محلے، میلے ٹھیلے، کھیت کھلیان، گھر، اسکول، سب بھول گئے کیا۔ کچھ بھی یاد نہیں..... وہاں کے تالاب کیا تمھارے ذہن میں سوکھ گئے..... وہاں کے درخت کیا تمھارے حافظے نے جلا دیے..... میری آنکھیں اس کے چہرے پر جمی رہیں اور وہ نظریں بچاتا رہا۔

پھر بڑی مشکل سے بولا..... "میں کراچی سے اگر ایک دن باہر رہوں تو دو ہزار کا نقصان ہو جاتا ہے۔ ہندوستان جاؤں تو کم از کم چالیس پچاس ہزار کی چوٹ پڑے گی۔"

یہ جواب دے کر وہ ایک دم بے خوف ہو گیا..... مجھے اس کی آنکھوں سے اندازہ ہوا جیسے وہ پوچھ رہا ہے۔ "کیوں دوست، تم بھی تو یہ نوکری چھوڑ کر ہندوستان جا کر سب کچھ دیکھ سکتے تھے..... تم کیوں نہیں گئے..... بولو اب میری باری ہے۔"

مجھے اس کی آنکھوں سے بڑا خوف محسوس ہوا جیسے وہ میری ذات کی گہرائیوں میں اندر گھس کر کوئی ایسی چیز تلاش کر رہی ہوں جو میں سامنے لانا نہیں چاہتا۔

ظاہر نہ ہو، چہرے پہ بہادری کے تیور سجا کر جواب دیتا۔

"نہیں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ باغ میں کبھی کبھی آدمی مل جاتا ہے تو ذرا اطمینان رہتا ہے اور نہیں ملتا ہے تب بھی میں گھبراتا نہیں ہوں۔" یہ کہہ کر دیہات کی طرف چل پڑتا۔ دونوں پیچھے مڑ کر ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے۔ سرفراز انوار کے اوجھل ہوتے ہی گردن کے تعویذ کو چھو کر محسوس کرتا اور جلدی جلدی آیتہ الکرسی پڑھنے لگتا۔ نہر کی پٹری پر مڑنے سے پہلے وہ چاروں قل پڑھ کر اپنے سینے پر پھونکتا اور پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا باغ کی طرف بڑھنے لگتا۔ یہ غروب کا وقت ہوتا تھا۔ سردیوں میں شامیں جلدی آجاتی تھیں۔ نہر کی پٹری پر مڑنے سے پہلے کچی سڑک پر اکا دکا آدمی سائیکل پہ آتے جاتے مل جاتے یا گھنٹیاں بجاتی بیل گاڑیاں گزرتیں تو اسے تقویت کا احساس رہتا لیکن پٹری پہ مڑتے ہی بالکل سناٹا ہوجاتا تھا۔ اوپر شیشم کے درخت پہ بیٹھا کوئی گدھ شاخ بدلتا یا پر کھول کر برابر کرتا تو وہ آواز اس سناٹے کو اور ڈراؤنا بنادیتی۔ اور یہی وہ وقت ہوتا تھا جب وہ آیتہ الکرسی بھول جاتا تھا۔ وہ قل ہو اللہ پڑھنا شروع کردیتا۔ اسی درمیان تیزی سے اول کلمہ طیب بھی پڑھ لیتا۔

اور اب سامنے باغ آتا۔ آموں کا بوڑھا باغ۔ ڈوبتے سورج کی زرد روشنی میں کہرے میں لپٹا باغ جس کے اندر دوپہر کے وقت بھی سورج ڈوبنے والے وقت جیسا اندھیرا ہوتا تھا کیوں کہ ایک دن اتوار کو اس نے دوپہر کے وقت بھی یہ باغ دیکھا تھا۔ شام کے وقت یہ باغ بالکل بدل جاتا۔ لگتا جیسے سارے درختوں کی چوٹیاں آپس میں گندھ گئی ہیں۔ فجری کے درخت کے نیچے سے ہو کر گزرتے ہوئے اسے اپنے دل کی تیز تیز دھڑکن صاف سنائی دیتی۔ اسے لگتا جیسے جنات بابا درخت سے اب اترے۔

باغ سے نکل کر ایکھ کے کھیتوں کے پاس پیڈھ پر گزرتے ہوئے اسے محسوس ہوتا کہ ابھی ایکھ کے کھیت سے نکل کر بھیڑیا اس کی ناگ پکڑ لے گا۔ وہ پسینے پسینے ہوجاتا۔ پھر گیہوں کے کھیت آتے۔ پھر پلکھن کے درخت کے اوپر گاؤں کی مسجد کے منارے اور مندر کے کلس نظر آتے۔ تب آہستہ آہستہ اس کے بدن کا کھنچاؤ دور ہوتا۔ ٹانگوں میں طاقت کا احساس پیدا ہوتا۔ پھر وہ بلند آواز میں کوئی فلمی گانا گانے لگتا۔

لیکن نواب نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا.... میں نے اس پر ترس نہیں کھایا تھا مگر اس نے مجھ پر رحم کیا۔

ہم دونوں نے ایک لمحے کے بعد صرف ایک ہی بات سوچی کہ ہم لوگ بہت بے اختیار ہیں اور بہت لاچار ہیں اور بہت مجبور ہیں اور بہت بے بس ہیں۔ میں اگر ایک بار ہندوستان جانے کے لیے اس ملازمت سے استعفیٰ دے دوں تو گھر والوں کی زندگی کی گاڑی کیسے آگے بڑھے گی.... اور نواب تم اگر فیکٹری چھوڑ کر بیس دن کو بھی پاکستان چھوڑ دو تو چالیس پچاس ہزار کا نقصان کون بھرے گا.... سچ مچ ہم بہت بے سکت ہیں۔

تالاب کے اس کنارے پر ایکھ کے ادھر ایک پیلا دائرہ آسمان کے دھندلے پس منظر میں اوپر اٹھا.... اس کا نچلا حصہ کچھ بے ڈول تھا.... آہستہ آہستہ وہ دائرہ مکمل ہوا اور دھیمے دھیمے سرخ ہو گیا۔

دور تالاب کے کنارے کھڑے درختوں پر غنودہ پرندوں نے بیٹھی بیٹھی بوجھل آواز میں پکار کر ایک دوسرے سے کہا کہ پھر سورج نکل آیا۔ پچھم کے کسی گاؤں کے ایک بے خواب کتے نے روتے ہوئے اعلان کیا کہ صبح ہو رہی ہے.... آسمان میں پرچھائیوں جیسے کچھ پرندے سورج کے آگے ہو کر نکل گئے.... صبح کا وقت عموماً اتنا غمگین اور اداس نہیں ہوتا لیکن آج تھا کیوں کہ ہمارے دکھوں کا تعلق ماحول سے یا وقت کی کیفیتوں سے نہیں ہوتا بلکہ ہمارے دلوں سے ہوتا ہے اور آج ہمارے دل بہت اداس تھے۔

کہرا چھٹا اور تالاب کا پانی آہستہ آہستہ صاف ہوا تو میں نے دیکھا کہ آبی پرندوں کا جھنڈ سلیم اللہ کے کنارے کی طرف ہے۔ دور سے تالاب میں مرغابیاں ایسی لگ رہی تھیں جیسے کھیت میں مٹی کے ڈھیلے بچھے ہوں۔ ایک طرف گنتی کی قازیں پڑی تھیں.... چھوٹے چھوٹے چھوں کا ایک پرا تالاب پر سرسرا رہا تھا.... اور تالاب کے دوسرے کنارے پر دو سارس خاموش کھڑے تھے۔

یکایک میں نے محسوس کیا کہ چڑیا ہوشیار ہو گئی ہے.... یک لخت، قیں قیں، کی بہت سی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ غلام علی کی طرف سے پہلا فائر ہوا۔ مرغابیاں سرسر کرتی

ہو ئی اٹھیں اور اس حصے کا پانی ٹیڑھی لکیریں بنانے لگا۔ سلیم اللہ کی طرف سے دو فائر ہوے اور دو مرغابیاں ڈھیلے بن کر زمین پر آ رہیں۔ سائیں سائیں کرتے ہوے یخ پر تالاب پر چکرا رہے تھے .... قازوں نے ایک تکونی صف بنائی اور پورب کے کسی تالاب کی طرف دھواں ہو گئیں۔ سیکڑوں کی تعداد میں چڑیاں آسمان پر چھائی ہو ئی تھیں لیکن ہماری بندوقوں کی پہنچ سے دور تھیں۔

"اگر یہ نالائق غلام علی فائر نہ کرتا تو چڑیاں ہمیں موقع دیتیں۔" میں جھنجھلایا....

"نہیں۔" نواب مسکرایا۔ "چڑیا پر تولنے ہی والی تھی جبھی غلام علی نے فائر کیا۔ دراصل زیادہ تر یخ تالاب میں پڑی تھی۔ اگر کنارے پر ہوتی تو ہماری طرف سے ضرور اڑان بھرتی .... چلو یہی غنیمت ہے کہ دو مرغابیاں ہاتھ لگ گئیں۔"

تب مجھے سلیم اللہ کی ماری ہو ئی مرغابیوں کا دھیان آیا۔ میں نے دیکھا سلیم اللہ بندوق ہاتھ میں اوپر اٹھائے کمر کمر پانی میں چڑیوں کے پیچھے جا رہا ہے۔ مجھے سلیم اللہ بہت لمبا چوڑا دیوزاد سا لگا جو ہاتھ آگے پیچھے کرتا ہوا پانی کاٹتا، چلنے کی رفتار سے بھاگ رہا تھا۔

دوسرے کنارے سے غلام علی بندوق ہاتھ میں اٹھائے اس کا ساتھ دینے کے لیے دوڑا۔

"میں آ رہا ہوں صاحب .... گھبرے رہنا .... اڑ جائیں گی...." پانی کے اوپر تیرتی ہو ئی اس کی آواز ہم تک آئی۔

"نہیں، گھبراؤ مت.... ان کے پر نوٹ گئے ہیں یہ اڑ نہیں سکتیں...." سلیم اللہ کی یہ آواز پانی کی شرر شرر سے زیادہ مہیب اور بھیانک تھی۔

میں نے غور سے دیکھا .... مرغابیاں پانی کی سطح پر پھڑک رہی تھیں اور زور زور سے پر چلا رہی تھیں۔ واقعی دونوں کے پنکھ ٹوٹ گئے تھے۔ اچانک سلیم اللہ کا ہاتھ آگے بڑھا اور اس نے مرغابیاں دبوچ لیں۔ ایسا محسوس ہوا جیسے پورے ماحول میں ایک بے محابا سناٹا چھا گیا ہو .... میں نے نواب کو دیکھا۔ اس نے میری طرف دیکھا .... اور ہم دونوں نے پاکستان، ہندوستان، چین اور منگولیا کے اوپر سائبیریا کے برفیلے میدانوں میں برف چومتے ہوئے ہزاروں معصوم پرندوں کو دیکھا، رنگ برنگے ہزاروں بھولے بھالے پنچھیوں کو دیکھا جو

میدانوں میں بارہ سنگھوں کے اوپر قطار اندر قطار اڑ رہے ہیں۔ برف سے زیادہ شفاف جذبوں میں مگن ہیں، اور ایک دوسرے کے پروں میں منقار پھرا پھرا کر اپنی الفت کا اظہار کر رہے ہیں۔ اچانک برف باری شروع ہو گئی ہے اور برف کے ذرات آسمان سے برسنے لگے ہیں۔ برف میں گھلی ہوئی ہوائیں شدت اختیار کر گئی ہیں۔ موسم ناقابل برداشت ہو گیا ہے۔ اور تمام پرندے اپنے انڈے برف میں دبا کر صفیں بنا کر نشیب کے ٹھکانوں کی طرف پرواز کر رہے ہیں۔ اس گرمی کی تلاش میں جو زندہ رہنے کے لیے ضروری ہوتی ہے اور اپنے دل کے ٹکڑوں کو الوداع کہہ رہے ہیں جو انڈوں کے خول میں بند برف میں دبے ہوئے ہیں۔ پھر یہ پرندے گرم آب و ہوا کے ٹھکانوں تک آتے آتے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے ہیں۔ راستے الگ ہو گئے ہیں لیکن منزل ایک ہی ہے۔ وہی منزل جہاں زندہ رہنے کے قابل گرمی میسر آسکے اور اس سے بھی آگے کی وہ منزل جب پھر اپنے برفیلے میدانوں میں سورج کی گرمی سے برف پگھلے اور سردی کم ہو اور موسم خوشگوار ہو جائے تو واپس برف چومنے اور بارہ سنگھوں کے جھنڈ پر پرواز کرنے کے لیے اپنے گھر واپس آسکیں.... اور پھر ہم دونوں نے دیکھا کہ ان معصوم پرندوں کے پر توڑ دیے گئے ہیں۔

سلیم اللہ ہم دونوں کے سامنے مرغابیاں دبوچے کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا شاید نواب بھی دیکھ رہا ہو کہ ان بھولے بھالے پنچھیوں کی آنکھوں میں برفانی میدانوں سے زیادہ وسیع، تالابوں سے زیادہ گہرے اور ان کے پروں سے زیادہ خوشنما رنگوں کے سپنے سجے ہوئے ہیں .... آنکھیں، جو تھوڑی دیر بعد بند ہونے والی ہیں، کہیں دور تک رہی تھیں۔ کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ میں نے ان کی گول گول پتھرائی ہوئی آنکھوں میں بہت سے منظر دیکھے جو وہ آنکھیں اب کبھی نہیں دیکھ سکیں گی.... میں نے ان کی آنکھوں میں جو منظر دیکھے ان میں نکیلی پتیوں والے بہت سے دیوقامت درخت تھے جو برف سے ڈھکے ہوئے تھے، ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتے بہت سے پرندے تھے، جو معصوم جذبوں اور امنگوں میں سرشار تھے۔ نیلے، ہرے اور زرد پروں والے بہت سے ساتھی تھے جن کی رفاقت انھیں میسر تھی۔

میں نے دل ہی دل میں کہا.... الوداع.... اے معصومو الوداع.... ان رفیقوں کو بھول

جاؤ۔ ان سرمستیوں کو فراموش کر دو۔ نکلی پتیوں والے درختوں کی بدمست شوخیوں کو دل سے نکال دو۔ ان عزیزوں کو یاد کر کے اپنا دل مت دکھاؤ جنھیں انڈوں کے خول میں بند کر کے تم برف میں دبا آئے تھے۔ اب سب بھول جاؤ۔ تمھارے پنکھ ٹوٹ گئے ہیں نا۔ اب تم کبھی وہاں نہیں جاؤ گے.... کبھی نہیں۔

غلام علی پہنچ چکا تھا۔ اس نے اور سلیم اللہ نے مل کر دونوں کو ذبح کیا۔ میں نے نواب کو دیکھا۔ وہ دوسری طرف منہ پھیرے کھڑا تھا۔

"صاحب.... اب دوپہر کو پھر آئیں گے۔ اس وقت تو چڑیا اڑ گئی۔ دوپہر کو پھر پڑے گی۔ تب تک گھر چلیے۔ کچھ ناشتہ پانی کر لیجیے۔"

میں نے تالاب کی طرف ایک نظر دیکھا.... پانی کفن کے کپڑے کی طرح یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا تھا.... بالکل خاموش اور گمبھیر۔

سڑک پر سناٹا تھا اور جیپ میں خاموشی.... ایسے ہی ہم غلام علی کے گھر تک پہنچے۔

"یہ میرا جھونپڑا ہے۔" غلام علی نے جیپ روک دی۔ ایک پرانا پکی اینٹوں کا مکان تھا جس کے آگے کا چبوترہ کچا تھا.... دروازے کے پیچھے بڑے گھیر کی شلوار پہنے دو ناگنیں آ کر کھڑی ہو گئیں۔ غلام علی نے چبوترے پر پلنگ نکال کر ہم لوگوں کو بٹھایا۔

اور اندر جا کر واپس لوٹ آیا۔ میرے ذہن کو اتنا یارا بھی نہیں تھا کہ اس سے منع کر سکوں کہ زیادہ تکلف سے کام نہ لے۔

غلام علی نے مجھ سے کہا۔ "صاحب! آپ ذرا اندر چلیں۔ جمیلہ سے مل لیں۔ وہ ضد کر رہی ہے۔"

میں نے نواب کو بتایا کہ اس کی بیوی ضلع ہردوئی کی ہے۔ اسے معلوم ہو گیا ہے کہ میں بھی یو۔ پی کا ہوں۔ شاید پاسپورٹ کے لیے کچھ کہے۔

نواب مجھے دیکھتا رہا....

دروازے سے داخل ہو کر میں اندر آنگن میں آ گیا.... غلام علی نے پکارا تو ایک اڑتیس چالیس سال کی عورت باہر آئی.... نازک ناک نقشے کی دبلی پتلی سی وہ عورت بڑے گھیر کی

شلوار پہنے ہوئی تھی.... میں نے سوچا غلام علی نے اسے بالکل پنجابی بنا دیا ہے.... وہ بے جھجک میرے پاس آکر بھولے پن سے زمین پر بیٹھ گئی کہ میں بوکھلا گیا۔

"بھیا.... سلام۔" اس نے مجھے سلام کیا مجھے محسوس ہوا جیسے میری کسی بہن نے مجھے آواز دی ہو....

"تم..... تمھیں جمیلہ ہو۔" میں نے سلام کا جواب دے کر اس سے پوچھا۔

"ہاں" وہ ایسے خوش ہوئی جیسے کسی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے ڈرائیور کی بیوی یہ جان کر خوش ہو سکتی ہے کہ صاحب اس کا نام جانتے ہیں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تو مجھے اپنے کمینے پن کا احساس ہوا۔ وہ تو ایسے مسرور تھی جیسے کوئی یہ جان کر کھل اٹھے کہ اس کا کوئی ہم وطن ناآشنائی کی دیوار کے پرے رہ کر بھی اسے جانتا ہے۔

"میرا پرمٹ بنوا دو بھیا.... میں ضلع ہردوئی جا کر اپنا گھر دیکھوں گی۔ میں نے ان سے کہا تھا لیکن یہ ان کے بس کا نہیں ہے۔ کہتے ہیں میں صاحب سے بات کروں گا۔ اب تو میں خود تم سے بنوا کر رہوں گی اپنا پرمٹ۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ میں اپنا کام تم سے خود کرالوں گی...." وہ ایک سانس میں اتنی باتیں کر گئی جیسے شہر کو جاتے ہوئے باپ سے بیٹیاں چھوٹی چھوٹی فرمایش کرتی ہیں۔

میں نے غلام علی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے وہی اسرار نظر آیا جو رات جیپ میں اس کی آواز میں تھا۔

"صاحب! اس سے سختی سے منع کر دیجیے کہ اس کا پرمٹ نہیں بن سکتا.... میرے چار پانچ سو انھ جائیں گے۔ اسے تو بلا فائدے کا شوق ہے بھارت جانے کا۔"

غلام علی کی آنکھیں میری آواز سے بھیک مانگ رہی تھیں اور اس کی بیوی مجسم کشکول بنی میرے پاس بیٹھی تھی۔

میں پھر بدحواس ہو گیا.... کیا میں اس سے اتنا بڑا جھوٹ بول سکوں گا.... کیا اتنا بڑا ظلم میری زبان کر سکے گی.... کیا میرا ضمیر اس کی اجازت دے گا....

غلام علی کی آنکھوں نے پھر اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔

"سنو جمیلہ۔" میں اس سے مخاطب ہوا..... "تمھارا پاسپورٹ نہیں بن پائے گا..... تم گھر نہیں جاسکو گی بہنو....."

مجھے اپنے ذہن میں شیشے کی کرچیں سی ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ جمیلہ کے معصوم چہرے پر ہزاروں پرچھائیاں آکر گزر گئیں۔

"کیوں..... کیوں بھیا..... کیوں نہیں بن سکتا۔ آپ نہیں بنوا سکتے۔ آپ تو سب سے بڑے دروغہ ہیں۔" وہ تم سے بات کرتے کرتے ایک دم آپ پر آگئی جیسے میں اس ایک لمحے میں بہت اجنبی ہو گیا ہوں۔

"ہاں..... دیکھ لو، سب سے بڑا دروغہ خود اپنا پرمٹ نہیں بنوا سکتا تو تمھارے لیے کیسے بنوا پائے گا۔" میں نے یہ کہہ کر جیڑے اتنی سختی سے بھینچ لیے کہ جیڑے ٹیس کرنے لگے۔

"لیکن وزیر الدین بھائی کی گھر والی نے تو اپنا پرمٹ بنوالیا تھا۔" وہ بولی جیسے مایوسی کے عالم میں یہی ایک حوالہ اس کا سہارا رہ گیا ہو۔

"ہاں۔" میں نے پھر اپنے ضمیر کی چھاتی پر بندوق داغی۔ "بنوا تو لیا تھا لیکن غیر قانونی تھا جبھی تو وزیر الدین نے جلادیا۔"

اس سیدھی سادی عورت نے اپنے کمین اور ذلیل بھائی کی گود میں سر رکھ کر اپنے وطن کے حساب میں شاید آخری آنسو بہائے۔

غلام علی یہ دیکھ کر سٹپٹا گیا..... وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے اسے روک دیا..... اچھا ہے رو دھو کر صبر کرلے۔ روز روز کے رونے سے تو نجات ملے گی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اس کا سر اپنے دونوں ہاتھوں سے اٹھایا۔ اس کے بالوں کو برابر کیا۔ گم سم کھڑے اس کے گول مٹول بچے کی مٹھی میں دس روپے کا نوٹ تھمایا اور باہر نکل آیا۔

بہت دیر کی خاموشی کے بعد میں نے نواب کو یہ سب باتیں بتادیں۔ وہ خاموش بیٹھا سنتا رہا..... اور سب کچھ سن کر ایسے مسکرایا کہ انسانوں پر اور انسانوں کے افعال پر اس انداز سے نہیں مسکرایا جاتا۔ ایسا تبسم تو صرف ناہموار معاشرے کے لیے وقف ہوتا ہے۔ ایسی تلخی کی تاب انسان کہاں سے لاسکتا ہے۔ میں بھی نہیں برداشت کرسکا۔ میں نے دوسری

طرف منہ پھیر لیا۔ باقی لوگ ناشتے میں مصروف رہے۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے نواب کی تلخ مسکراہٹ پیچھے سے تیز چھری کی طرح میری پیٹھ میں داخل ہو رہی ہے۔

میں نے سوچا.... تم خود کو کون سا بڑا سورما سمجھتے ہو۔ تم اگر میری جگہ ہوتے تو کیا اپنے ماتحت کی پیسہ پیسہ جوڑی ہوئی کمائی کو اس کی بیوی کے بے ہنگم شوق میں تباہ کرنے کے روادار ہوتے....

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ نواب بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ ہر قسم کے جذبے سے اس کا چہرہ عاری تھا.... شاید وہ خود بھی یہی سب کچھ سوچ رہا تھا۔

تالاب پر جانے کے لیے جیپیں دوبارہ چل پڑیں.... گاؤں کے بہت سے لوگ ہمیں دیکھنے آگئے تھے.... غلام علی نے بہت مدبرانہ انداز میں ہاتھ ہلا ہلا کر گاؤں والوں کو خدا حافظ کیا۔ جیسے کہہ رہا ہو.... مجھے معمولی آدمی مت سمجھو.... میرے گھر پر سپرنٹنڈنٹ پولیس ناشتہ کرتے ہیں.... میں نے اس کے انداز پر مسکرانے کی کوشش کی.... میں نے مڑ کر دیکھا.... غلام علی کے گھر کی چھت پر ایک عورت کھڑی تھی۔ ضلع ہردوئی کی ایک لڑکی جو یہاں آکر بڑے گھر کی شلوار پہننے لگی تھی۔ اس کے بال بکھر گئے تھے اور دوپٹہ ہوا میں زور زور سے ہل رہا تھا۔

میں نے نواب کو دیکھا، اس نے مجھے دیکھا اور ہم دونوں نے اس پنکھ نوچی مرغابی کو دیکھا۔

پرندے تیرے پر ٹوٹ گئے۔ تو اب واپس برف کے میدانوں میں نہیں جا سکتا۔

خدا حافظ اے معصوم عورت.... تو بھی اس سرزمین کو نہیں دیکھ سکے گی، جہاں تیرا شعور بیدار ہوا تھا.... جہاں تو نے لوک گیت سنے تھے۔ جہاں تو نے ساون کے جھولے جھولے تھے، جہاں تو نے اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ ہنڈکلیاں پکائی تھیں۔ جہاں مرغی کے ڈربوں میں چھپ چھپ کر تو نے آنکھ مچولیاں کھیلی تھیں۔ جہاں تو نے شوخ امنگوں کے رنگ سے رنگے ہوئے ست رنگے دوپٹے اوڑھے تھے۔ جہاں تو نے اپنے تھے سے دل میں نرم نرم جذبوں کو مٹھی میں پکڑ کر بند کر لیا تھا۔ سب بھول جا میری پیاری بہن.... وہاں کے نام پر بہائے گئے

تیرے آخری آنسو میرے شکاری کوٹ کے دامن میں محفوظ ہیں۔ بس یہ آخری آنسو ہیں۔ اب کوئی آنسو نہ بہے کہ کچھ اور لوگ بھی بے حد اداس ہیں۔ کہیں ان کی اداسی بھی بے قیمت پانی کی طرح آنکھوں سے نہ بہہ جائے۔ تالاب کی سطح پر پھڑکنے سے فائدہ کیا.... آڑ میں چھپے شکاری نے تیرے پر کب کے توڑ دیے.... اب کیا دھرا ہے۔ میں نے گردن موڑ کر سیٹ سے نکالی.....

جیپ کچے دگڑے پر دھول اڑاتی بھاگتی رہی۔

"تم نے شادی کرلی....؟ میں یہ پوچھنا تو بھول ہی گیا۔" نواب کی آواز جیپ کے انجن سے زیادہ پرشور تھی۔ حالانکہ اس نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا تھا۔

ایک انجانے خوف کے باعث میں نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ صرف اس کا ہاتھ دبا کر اثبات میں سر ہلادیا۔

"بچے کتنے ہیں؟" اس نے پھر سوال کیا۔

"تین۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

اور اب نواب تم جو پوچھو گے وہ مجھے معلوم ہے.... پوچھ لو کوئی بھڑاس نہ رہ جائے تمھارے دل میں.... آج ساری حسرتیں پوری کرلو....

"ان کا کوئی خط آیا کبھی؟" نواب نے پوچھا۔

شاباش میرے دوست.... زندہ رہو.... میں نے کہا تھا نا کہ ابھی میرے پورے زخم کہاں ہرے ہوئے ہیں سو تم نے وہ آخری زخم بھی کرید دیا.... "کس کا خط" میں نے آنکھیں کھول کر نواب کو یوں دیکھا جیسے میں کچھ جانتا ہی نہیں۔

نواب نے مجھے ایسے دیکھا جیسے سپاہی چور کو دیکھتا ہے۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اسے خاموش کردیا.... کیوں کہ میں چور تھا اس لیے میں نے اس سے نظریں نہیں چار کیں.... اور آنکھیں بند کرلیں۔ دوپہر کے سورج کی چمک آنکھوں پر براہ راست پڑ رہی تھی اور آنکھوں کے پپوٹوں کو وہ حرارت بہت خوش کن محسوس ہو رہی تھی.... باہر میں نے ابھی دیکھا تھا کہ کہرا بالکل چھٹ گیا تھا اور کھیت بہت اجلے اجلے نظر

آرہے تھے.... تالاب دور تھا۔ اور ماضی کے آئینہ خانے کا سب سے رنگین عکس جس کی تعمیر میں صرف لفاظی کام نہیں دیتی بلکہ اس تصویر کو مکمل کرنے کے لیے خون جگر کی آمیزش کی ضرورت ہوتی ہے.... میری محبت کا عکس میرے سامنے چمک رہا تھا۔

پیدا ہونے سے لے کر نبض رکنے تک یہ جذبہ کتنے روپ بدلتا ہے۔ لیکن اس کا ہر رخ خوش گوار ہوتا ہے۔ ماں کے دودھ سے محبت ہو یا باپ کی شفیق گود سے، بھائی کی محبت ہو یا بہن کی چاہت، دوست سے محبت ہو یا محبوبہ سے.... اس کا ہر رنگ دل کش ہے۔ اور میری زندگی کی البم کی حسین اور سب سے معصوم تصویر میرے سامنے آگئی۔

گرمیوں کی ایک تپتی ہوئی دوپہر میں ہوائیں اپنی گود میں انگارے بھرے ہوئے اونچے اونچے درختوں سے سر ٹپک رہی ہیں۔ ایک لق و دق مکان کے کچے، سیلے اور ٹھنڈے دالان میں ایک برہمپتر جیسی بپھری اور ہمالیہ جیسی خود سر جوان لڑکی کھڑی ہے.... اور وہیں ایک ستون کے سہارے ایک بے باک لڑکا کھڑا ہے۔ اس نے ابھی ابھی لڑکپن سے دامن چھڑا کر جوانی کے کارزار میں قدم رکھا ہے اور وہ اتنا ہی گستاخ ہے جتنا اس عمر میں ہونا چاہیے۔ "تو بھیا معلوم یہ ہوا کہ آپ مجھ سے محبت فرماتے ہیں؟" اس لڑکی نے مذاق اڑانے والے انداز میں اس سے پوچھا۔

وہ لڑکا خاموش رہا.....

"کب سے عشق فرما رہے ہیں؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"ہوں۔ تمھیں معلوم ہے میں تم سے بڑی ہوں۔" لڑکی نے کہا۔

"تو یہ اپنے ہاتھ میں تھوڑے ہی ہے...." لڑکے نے منہ کھولا۔

اس معصوم توجیہہ پر وہ مسکرائی تھی۔

باہر لو کے جھونکے انھیں دیکھ کر چپ چاپ ٹھہر گئے۔

اور معلوم نہیں کیسے اس لڑکی نے جسے مغرور، بد دماغ اور خود پرست جیسے الفاظ سے یاد کیا جاتا تھا، جسے یہ فخر حاصل تھا، اگر یہ چیز فخر کے قابل ہے تو، کہ اس کی جوانی کے دامن پر

ایک بھی داغ نہیں تھا، آگے بڑھی اور اس لڑکے سے کہا کہ وہ اس کی برہم پتر جیسی جوانی کو بانہوں میں بھر کر اس کے ہمالیہ جیسے سر کو اپنی محبت کے زور سے نیچا کر دے۔ وہ لڑکا آگے بڑھا اور اس نے بچپن، لڑکپن اور شروع جوانی کے اس طویل عرصے میں پہلی بار کسی جوان جسم کے گداز کے لمس کو محسوس کیا اور ان پاک ہونٹوں کو چوم لیا جن کی تقدیس خود اس کے دل میں تھی۔

ایک سال تک دونوں انھیں معصوم جذبوں میں کھیلتے رہے۔

پھر سیشالیس آیا.... منہ پھاڑے، دانت نکالے تقسیم کا حکم نامہ ہاتھ میں لیے.... کوہ ندا سے یا اخی یا اخی کی آوازیں آئیں اور جس دن وہ لڑکا سب کچھ چھوڑ کر ایک انجان دیس کو جا رہا تھا اس دن وہ اس لڑکی سے ملا.... دل بھی قابو میں تھا، جذبات بھی قابو میں تھے، صرف قدم بے قابو تھے جو بلا سوچے سمجھے نامعلوم بے نشان منزل کی سمت اٹھنے والے تھے۔

"تو آپ چل دیے۔" اس نے پوچھا تھا۔

اس لڑکے کے پاس جواب دینے کو الفاظ تو بہت تھے پر ہمت نہیں تھی۔

"وہاں جا کر مجنوں فرہاد بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں والدین کہیں شادی کر لینا سمجھے۔"

وہ لڑکا لڑکیوں کی طرح رونے ہی والا تھا کہ اس لڑکی نے مردوں کی طرح اسے دلاسا دیا۔ کھوکھلے دلاسے.... کہ تم دو چار سال بعد آنا اور مجھے بیاہ کر لے جانا۔

دونوں جانتے تھے کہ یہ ناممکن ہے۔ لیکن دونوں ایک دوسرے کو اطمینان دلاتے رہے کہ اس کے علاوہ چارہ بھی کیا تھا۔

تو پھر یوں ہوا کہ برف باری ہونے لگی۔ برف کے ذرات آسمان سے برسنے لگے۔ ہوائیں شدت اختیار کر گئیں۔ موسم ناقابل برداشت ہو گیا.... اور پرندوں کا وہ جھنڈ زندہ رہنے کے قابل گرمی حاصل کرنے کے لیے دوسری سرحدوں میں چلا گیا.... انڈوں کے خول میں بند اپنی عزیز چیزوں کو برف میں دبا کر، دوبارہ واپس آنے کی امید میں صفیں کی صفیں پرے کے پرے دوسری بستیوں میں پرواز کر گئے۔

مہینے میں دو چار بار ایسا بھی ہوتا کہ باغ میں داخل ہوتے ہی اسے آدمی نظر آجاتا جو عموماً پھاوڑا لیے جھونپڑی کی طرف جا رہا ہوتا تھا۔ اسے دیکھ کر سرفراز باغ میں ہی فلمی گانا شروع کر دیتا۔ گانا بیچ میں روک کر وہ بہت اپنائیت کے ساتھ آدمی کو سلام کرتا۔

آدمی اس کا سلام سن کر پھاوڑا زمین پر رکھ کر آنکھیں مچمچا کر اسے دیکھتا۔

"رام رام بیٹا..... پٹواری صاب کے بھانجے ہو۔ انھیں ہماری رام رام بولنا۔"

وہ روزانہ اسی بھروسے پہ کالج سے گھر آنے کی ہمت کر پاتا تھا کہ شاید آج بھی آدمی مل جائے۔ اگر یہ آسرا نہ ہوتا تو وہ روپیٹ کر کالج سے نام کٹا کر اپنے گاؤں واپس جا چکا ہوتا۔

لیکن آدمی روزانہ نہیں ملتا تھا۔ ایک دن کالج سے نکلتے نکلتے دیر ہو گئی۔ وہ گراؤنڈ پر والی بال کا میچ دیکھنے میں ایسا محو ہوا کہ وقت کا احساس ہی نہیں ہوا۔ جب دیر کا احساس ہوا تو اس نے سورج کی طرف دیکھا جو آج قصبے میں ہی زرد ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے کالج کے گیٹ سے باہر نکلا اور دیہات کی طرف چل پڑا۔ نہر کی پٹڑی پر مڑتے ہی اس نے اپنے بدن میں یہ سوچ کر سنسنی محسوس کی کہ اب تو باغ سے آدمی بھی چلا گیا ہوگا۔ اس نے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور شیشم کے درخت کے نیچے سے گزرا۔ درخت کے نیچے سے نکلتے ہی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی درخت سے اُتر کر اس کے پیچھے چل پڑا ہو۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کا حلق بند ہو رہا ہے۔ وہ سہما سہما دھیمے دھیمے قدموں سے آگے بڑھا۔ پیچھے کی آہٹ اچانک تھم گئی۔ اسے لگا جیسے جنات بابا پیچھے سے اس کی کمر کا نشانہ لے کر جادو کی گیند مارنے ہی والے ہیں۔ اس نے تیزی سے کلمہ پڑھا اور کنکھیوں سے پیچھے دیکھا۔ وہ ایک بڑا بندر تھا جو چلتے چلتے اچانک رُک کر زمین پر دونوں ہتھیلیاں ٹیکے اس کی طرف دیکھ کر خر خر کر رہا تھا۔ اسے بندر سے بھی ڈر لگتا تھا لیکن جنات بابا کے مقابلے میں کم۔ اس نے اپنا بستہ بہت کس کے پکڑا اور باغ کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ آج آگے کا راستہ بھی بند تھا اور پیچھے کا بھی۔ آگے سنسان باغ جس میں اب آدمی ہونے کی اسے کوئی اُمید نہیں تھی اور پیچھے بندر۔

سورج ڈوبے دیر ہو چکی تھی اور باغ کے درخت دھیمی آواز میں شام کی سرگوشیاں شروع کر چکے تھے۔ وہ باغ میں داخل ہوا۔ آگے بوڑھے فجری کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کا

اس لڑکی کا اسے کوئی خط نہیں ملا کیوں کہ جس گھرانے کی وہ لڑکی تھی وہاں کا دستور نہیں تھا کہ غیر لڑکوں کو خط لکھے جائیں وہ بھی دوسرے ملک میں۔

پاکستان آنے کے بعد وہ لڑکا اس دریا کے کنارے بیٹھ کر ریت پر ایک عرصے تک محل بناتا رہا جس کا پانی دونوں ملکوں میں بہتا ہے۔ محل جب بن کر تیار ہوتا تو دریا کی تند اور ظالم لہریں اس کے محل کو تباہ کر دیتیں کیوں کہ دریا کا پانی دوسرے ملکوں سے بہہ کر آتا تھا... ..... اگر دوسرے ملک میں اسی دریا کے کنارے پر کوئی اور لڑکا محل بناتا اور لہریں اسے برباد کر دیتیں تو وہ لڑکا بھی یہی سوچتا کہ پانی دوسرے ملک سے بہہ کر آرہا ہے۔

محبت کے محل بنتے بگڑتے رہے لیکن دریا کی روانی نے تو بڑے بڑوں کو پسپا کیا ہے۔ اس لڑکے کی کیا حقیقت تھی اور پھر ریت تو ریت ہی ہوتی ہے۔

"کیا سوچنے لگے؟" نواب کی آواز نے مجھے واپس بلالیا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے آنکھیں کھول دیں۔

نواب نے مسکرا کر میرے جھوٹ کو تھپکی دی۔

ہندوستان سے آنے کے بیس سال بعد معلوم ہو سکا تھا کہ بیگم کی شادی کسی شرابی اور دق زدہ آدمی سے کر دی گئی تھی کہ ہمارے ہاں شریف اور ستم رسیدہ خاندانوں میں لڑکیوں کی شادیاں ایسی ہی دھوم دھام سے ہوتی ہیں۔

"سنو!" نواب نے مجھے پھر پکارا۔

"ہوں۔" میں نے آنکھیں کھول دیں۔

"بیگم بیوہ ہو چکی ہیں۔ ان کے شوہر کو نی بی کا عارضہ تھا نا اور اس پر شراب۔ تمھیں معلوم ہوا تھا یہ؟" نواب نے میری سماعت میں زہر بھر دیا۔ میرے کانوں کے قریب ہزاروں کی تعداد میں چھوٹے چھوٹے تیر سائیں سائیں کر رہے تھے جن کی نوکیں بہت تیز اور چمکتی ہوئی تھیں۔

آنکھیں مکمل کھول کر میں نے باہر دیکھا۔ جیپ تالاب کے قریب پہنچنے ہی والی تھی۔ باہر گیہوں کے کھیتوں میں چھوٹے چھوٹے پودوں پر دھوپ برس رہی تھی۔ دور کے

درختوں کی چوٹیوں پر ہوائیں بلاؤں کی طرح چلا چلا کر ناچ رہی تھیں۔

"اے خدا! آج ماحول پر اتنا دکھ کیوں چھایا ہوا ہے؟" میں اس سے سوال کر رہا تھا جو عام انسانوں کو کچھ نہیں بتاتا۔ جس سے کچھ پوچھنے کے لیے پیغمبر ہونا ضروری ہوتا ہے۔

"نواب..... بیگم بیوہ ہو گئیں؟" میں نے نواب سے ایسے پوچھا جیسے اس سے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ بیگم کیوں بیوہ ہوئیں؟

"تمھیں اب معلوم ہوا ہے۔ انھیں تو بیوہ ہوئے بھی برسوں گزر گئے۔ تو تمھیں تو یہ بھی نہیں معلوم ہوگا کہ میری غزالہ بھی مر گئی....."

اف..... خوب چرکے لگالو آج..... یہ خبر ہی کون سی کم تھی کہ بیگم بیوہ ہو گئیں کہ تم نے یہ بھی کہہ دیا کہ ہرنی کی طرح معصوم اور چنچل تمھاری غزالہ بھی مر گئی..... نواب میں تم سے ہرگز یہ نہیں پوچھوں گا کہ غزالہ کیسے ختم ہوئی اور بیگم بیوہ ہو کر کیسے جی رہی ہیں..... خدا جانے تمھارے ترکش میں اور کتنے تیر باقی ہوں۔

جیپیں رُک گئیں۔ سب سے آخر میں ہم دونوں اُترے۔

غلام علی نے قریب آکر کہا۔

"صاحب اس بار چڑیا اس کنارے پر ہے اور کچھ بیچ میں پڑی ہے۔ اب آپ سوچ لیں کہ کیسے داؤ لگے؟"

سورج کی تیز کرنیں تالاب پر براہ راست پڑ رہی تھیں۔ اور پرندوں کے خوشنما رنگ چمک اُٹھے تھے۔

"میں ادھر ایکھ کے کنارے پہلی والی جگہ پر بیٹھوں گا۔ تم نواب ذرا ہٹ کر ان جھاڑیوں کی آڑ پکڑ لو۔ اور سلیم اللہ صاحب آپ اور غلام علی دوسرے کنارے پر جا کر بیٹھے پر فائر کریں..... چڑیا اٹھے گی تو لامحالہ ہمارے سروں پر سے جائے گی تبھی داب لیں گے....."

یہ ہدایتیں دے کر میں اپنی جگہ پر آ گیا۔

غلام علی اور سلیم اللہ اپنے کنارے کی طرف چل پڑے۔ وہ دونوں دھیرے دھیرے باتیں کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے..... میں نے کونے میں ایک جگہ بنالی۔ نواب بندوق میں

چمکتے ہوئے نئے کار توس لگا کر جھاڑیوں کی طرف بڑھ گیا۔

چڑیا بالکل غافل تھی کیوں کہ اس کنارے سے بہت دور تھی۔ میں نے بندوق تیار کرلی۔

یکایک میرے سر پر سرسراہٹ ہوئی اور سیخ پر کا ایک پرا آگے جا کر پانی میں پر توڑ کر گر پڑا..... تھوڑی دیر تک کچھ شور رہا..... پانی کی لہریں بنیں اور بگڑیں اور پھر وہی خاموشی اور تالاب کا سکوت.....

ابھی ابھی جب یہ سیخ پر آکر پانی میں گرے تو میں نے محسوس کیا، صرف محسوس کیا، کہ ان پرندوں کی آنکھوں میں بھی تو وہی سپنے ہیں جو صبح ان پرندوں کی آنکھوں میں تھے، جن کے پنکھ نوٹ گئے تھے..... وہی اپنے دیس واپس جانے کے سپنے..... وہی شفاف برف چومنے کے سپنے..... کتنی دیر اور ہیں یہ خواب ان کی آنکھوں میں۔

تالاب کے ادھر کھیتوں میں کہیں کہیں ایکھ کے پودے غیر معمولی طور سے حرکت کر رہے تھے..... غلام علی اور سلیم اللہ فائر کرنے کے لیے کھیتوں میں چھپے ہوئے آہستہ آہستہ پرندوں کی طرف بڑھ رہے ہوں گے۔

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ کبھی محسوس ہوتا پانی ساکت ہو گیا ہے۔ کبھی لگتا پرندے بے حرکت ہو گئے ہیں..... دیر تک پانی پر نظریں جمائے رہنے سے سکوت اور حرکت کا فرق مٹ جاتا ہے۔ سب ایک جیسا ہو جاتا ہے۔ ہاں ہر فرق مٹ جاتا ہے اور آج اس تالاب پر بیٹھے ہوئے مجھے یہ محسوس ہوا کہ یہ پانی ہی نہیں، کائنات کی ہر چیز ساکت ہو گئی ہے ..... بالکل بے حرکت ہو گئی ہے..... اگر حرکت ہے تو صرف ان سپنوں میں جو ان پرندوں کی گول گول بھولی بھالی آنکھوں میں چمک رہے ہیں۔ اگر زندگی ہے تو صرف اس امید میں کہ ہم واپس گھر جائیں گے۔ اگر گرمی ہے تو صرف اس جذبے میں کہ ہم دوبارہ برف چوئیں گے۔ اگر جوش ہے تو صرف اس اُمنگ میں کہ ہم اپنی چھوڑی ہوئی عزیز چیزیں واپس پائیں گے جو انڈوں کے خول میں بند ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔

نواب تم اس وقت دور بیٹھے ہو، تھوڑی دیر بعد میں تمھیں بتاؤں گا۔ ہاں مجھے ابھی ابھی

یہ خیال آیا کہ تمھیں بتاؤں ہم لوگ پنکھ ٹوٹے پرندے ہیں۔ وزیرالدین کی بیوی اور غلام علی کی بیوی کے بھی پنکھ ٹوٹ گئے ہیں اور ہمارے تمھارے پنکھ بھی توڑ دیئے گئے ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی اس قابل نہیں بچا کہ وہاں جا کر اپنے ہونٹوں سے شفاف برف چوم سکے۔ نواب احمد ،ہم ان پرندوں سے بھی زیادہ لاچار اور بے بس ہیں کہ کم از کم وہ اپنے پنکھ ٹوٹ جانے کے بعد ذبح تو کر دیئے جاتے ہیں، اور ہم لوگ..... ہم لوگ تو لمحہ لمحہ ذبح ہو رہے ہیں۔ ہماری اُمنگیں لمحہ لمحہ قتل کی جا رہی ہیں۔ ہمیں سسکا سسکا کر تڑپایا جا رہا ہے۔ ہمارا شکار ایک دفعہ میں نہیں ہوتا بلکہ دھیرے دھیرے ہوتا ہے۔ ہم اس تالاب میں صرف پھڑک سکتے ہیں، جان نہیں دے سکتے۔ تھوڑی دیر بعد تمھیں سب کچھ بتاؤں گا۔

اچانک دوسرے کنارے پر فائر ہوا اور میں دہل اٹھا۔ محسوس ہوا کہ دھوپ اور تالاب کا پانی بالکل سرخ ہو گئے ہیں۔ پوری فضا بالکل گہری سرخ ہو گئی ہے۔ جانے کتنے تالاب میں پھڑکے، جانے کتنوں کے پنکھ ٹوٹے۔

چڑیا نے اڑان بھری اور چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ کر پرواز کرنے لگی۔

نیچی اڑان کرتا ہوا ایک پرا میرے سر پر سے گزرا۔ میں نے بندوق اٹھائی تو میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھوں پر خون لگا ہوا ہے۔ میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اتنا چمکتا ہوا خوش رنگ لہو کسی جان دار کا نہیں ہو سکتا.... یہ تھکی ہوئی جاگتی آنکھوں کے خوابوں کا خون تھا۔ برف کے میدانوں میں واپس جانے کی امنگوں کا خون تھا۔ ایک دوسرے کے پروں میں منقار پھرا پھرا کر الفت اور رفاقت کا اظہار کرنے کے جذبوں کا خون تھا۔

خدا جانے کیسے بندوق نیچے جھک گئی۔

پرندے نواب کے سر پر سائیں سائیں کر رہے تھے۔

غلام علی چلا رہا تھا.... ہم دونوں سے کہہ رہا تھا.... "حضور داغو.... حضور داغو.... اوپر آ گئی ہیں اوپر...."

میں نے اپنے ہاتھوں کو جن پر خون چمک رہا تھا، قریب لا کر پوچھا کہ مجھے بتاؤ کہ میں کس سے پوچھوں کہ بیگم اب کیسے جی رہی ہیں اور جی بھی رہی ہیں یا کسی کچی قبر میں اپنے

ارمانوں کے کفن میں لپٹی سو رہی ہیں۔ مجھے کیسے معلوم ہو کہ غزالہ کیوں مر گئی..... وہ بزرگ اور ماسٹر اب وہاں ہیں یا ان کے شفیق چہرے وقت کی دھول میں اٹ کر کہیں کھو گئے..... وہ گھر اب گھر ہے یا کھنڈر ہو گیا۔ جہاں ہم نے تاج محل سے زیادہ حسین محل بنائے تھے..... وہاں کے نوعمر لڑکے اب بھی مئی جون میں اپنے کومل بدن دھوپ میں جھلساتے ہیں یا نہیں۔

لیکن ہاتھوں پر اب خون کہاں تھا۔ وہ تو بس اسی وقت جانے کہاں سے آن ٹپکا تھا جب پرندوں پر میں نے بندوق اٹھائی تھی۔

میں نے پرندوں کی ایک صف کو پورب کی طرف دھواں ہوتے دیکھا۔

میں نے ان سے چپکے سے کہا.....

"دیکھو پر سلامت تو لے کر جا رہے ہو لیکن اتنا کرنا کہ ہندوستان پر سے گزرو تو ان لوگوں کا ماتم کر لینا جو یہاں سے جا کر بے وطن ہو گئے تھے..... دیکھو، جرمنی کی طرف بھی ایسے ہی قصے ہیں۔ وہاں سے اگر گزرو تو تھوڑے اداس ہو جانا..... ہمیں تو تم نے دیکھ ہی لیا..... لیکن ہم اکیلے تھوڑے ہی ہیں..... وزیر الدین کی بیوی ہے، نواب ہے، ہر جگہ تم کو ایسے کتنے ہی شکستہ پر ملیں گے، جہاں کسی کو دیکھنا تو سمجھ لینا کہ یہ بھی برف چومنے کے سپنے دیکھ رہا ہے، بس وہیں تم بھی ذرا دکھی ہو لینا..... جاؤ اب پہاڑوں کے پیچھے اپنے وطن واپس چلے جاؤ..... وسیع میدان، پتیلی پتیوں والے دیوقامت خوبصورت درخت اور برف میں دبی ہوئی انڈوں کے خول میں بند تمھاری عزیز چیزیں تمھارا انتظار کر رہی ہیں..... الوداع..... خدا تمھاری پرواز کا حافظ ہے۔

پرندوں کا آخری پر ابھی آسمان کی وسعتوں میں دھوئیں کی لکیر بن چکا تھا..... تالاب چاندی جیسا شفاف ہو چکا تھا..... غلام علی اور سلیم اللہ ہاتھ ہلا ہلا کر کسی بات پر بحث کرتے ہوئے چلے آ رہے تھے..... ان کی آوازیں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح میرے کانوں میں آ رہی تھیں۔

میں ایکھ سے باہر آ گیا..... میں نے جوتوں کی کیچڑ جھٹکی۔ سامنے سے نواب آ رہا تھا۔

"تم نے فائر کیوں نہیں کیا؟" اس نے دور سے ہی پوچھا۔

تمام ماحول بے حد پراسرار ہو گیا .... درختوں اور کھیتوں کی سرسراہٹ بھی بالکل خاموش ہو گئی.... کنارے پر بیٹھا سارس کا جوڑا بھی چپ ہو گیا.... پانی کی شرر شرر بھی بالکل معدوم ہو گئی۔

"وہ.... نواب.... پرانے کارتوس تھے۔ دغا دے گئے، سب مس ہو گئے...." میں ایک ساتھ اتنے جھوٹ بول گیا۔

"لیکن سنو۔" میں نے اسے مخاطب کیا۔

"ہوں.... کیا ہے۔" اس نے چور نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

"تم نے فائر کیوں نہیں کیا.... ایک آدھ چڑیا تو گرا ہی لیتے کم از کم۔ بالکل تمھارے سر پر اڑ رہی تھیں...."

وہ تھوڑی دیر تک خاموش کھڑا رہا.... اتنا خاموش کہ مجھے اس کی خاموشی سے ڈر لگنے لگا۔ پھر وہ میرے بہت قریب آ کر ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولا....

"میرے ساتھ بھی وہی سب کچھ ہوا تھا جو تمھارے ساتھ پیش آیا۔"

ہم دونوں کی بندوقوں نے ایک ساتھ چار فائر کیے.... کنارے بیٹھا سارس کا جوڑا اڑ گیا .... غلام علی اور سلیم اللہ چونک پڑے.... غلام علی بلا سوچے سمجھے روتا چلاتا ہماری طرف بھاگا....

حیران کھڑے نواب کے ڈرائیور نے ہمارے ہاتھوں سے بندوقیں سنبھال لیں۔

میں اور نواب ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، دیر تک ایک دوسرے کو سمجھتے رہے۔ اور پھر معلوم نہیں کیسے ہم دونوں نے ایک ہی فیصلہ کیا..... ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر خاموش ہو گئے۔ اور اتنی مشکل سے اپنے پہ ضبط کیا کہ بس منہ آ گیا.... ہم پانچوں خاموش تھے.... ہوائیں بہت تیز ہو گئی تھیں۔ اور تالاب کا پانی کناروں سے چھلک آیا تھا۔

جنرل نالج سے باہر کا سوال

جنرل نالج سے باہر کا سوال

گول چبوترے پر کھڑے ہو کر چاروں راستے صاف نظر آتے ہیں، جن پر راہ گیر سواریاں اور خوانچے والے چلتے رہتے ہیں۔

چبوترے پر جو بوڑھا آدمی لیٹا ہے، اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہیں۔ کہیں کہیں پیوند بھی لگے ہیں۔ اس کی داڑھی بے ترتیب ہے اور چہرے پر لاتعداد شکنیں ہیں۔ آنکھوں کی روشنی مدھم ہو چکی ہے۔

وہ راستے پر چلنے والے ہر فرد کو بہت حسرت سے دیکھتا ہے۔ جب کوئی خوش خوش اس کے پاس سے گزرتا ہے تو وہ دور تک اور دیر تک اسے دیکھتا رہتا ہے۔

کسی طرف سے ایک دس گیارہ برس کی بچی آئی۔ وہ اسکول کی پوشاک پہنے ہوئے ہے بستہ کندھے پر لٹکا ہے۔ ناشتہ کا ڈبہ ہاتھ میں دبا ہے۔ لڑکی کے بال سنہری ہیں۔ چہرہ گلابی ہے، اور آنکھوں میں ایک سادہ سی چمک ہے۔ بے فکری، خوشحالی اور بچپن جب ایک جگہ جمع ہو جائیں تو آنکھوں میں ایسی ہی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔

اسے آتے دیکھ کر بوڑھے کی آنکھوں میں کچھ چمکا۔ جب وہ پاس سے گزری تو بوڑھے نے ہاتھ بڑھا کر اس کے پیر چھوئے۔ بچی جھجک کر کھڑی ہو گئی۔ ایک لمحہ تک بوڑھے کو دیکھتی رہی۔ پھر اس کی آنکھوں میں خوف چمکا۔ گھر کی نصیحتیں ذہن میں کلبلائیں، لیکن بوڑھے کے چہرے پر اس نے جانے کیا دیکھا کہ آنکھوں کا خوف مدھم پڑ گیا اور بھولا بھالا چہرہ دردمندی کے جذبے سے سرشار ہو گیا۔ اس نے بہت اپنائیت سے پوچھا۔

"کیا بات ہے بابا۔ بھوک لگی ہے؟"

بوڑھا دھیمے سے مسکرایا۔

"ہاں۔ لیکن میں نے تمہیں اس لیے نہیں روکا۔"

لڑکی کی آنکھوں میں حیرت جاگی۔ اس نے بوڑھے کا ہاتھ اپنے پیروں پر سے آہستگی کے ساتھ ہٹایا اور چبوترے پر اس کے پاس بیٹھ کر پوچھا۔

"میرے پاس پچاس کا سکہ ہے۔ تم لوگے؟ تمہیں ضرورت ہے؟"

"ہاں ضرورت ہے، لیکن میں نے تمہیں اس لیے نہیں روکا۔"

لڑکی کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"پھر تم نے مجھے کاہے کو روکا بابا؟"

بوڑھے نے بہت نحیف آواز میں اس سے کہا۔

"منّی! بڑا احسان ہوگا اگر تم میرا ایک کام کردو۔"

بچی نے اپنا بستہ اتار کر چبوترے پر رکھا اور بوڑھے کے قریب کھسک کر بہت اپنے پن کے ساتھ کہا۔

"بتاؤ کیا کام ہے تمہارا۔ میرے کرنے کا ہوگا تو میں کردوں گی۔ نہیں تو پاپا سے کہہ کر کرادوں گی۔ وہ بہت اچھے ہیں۔ سب کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اس دفعہ سردیوں میں انہوں نے پڑوس کے گھر میں دو کمبل دیئے تھے۔ جمیلہ کی اماں اور اس کے بھائی کو بہت سردی لگتی تھی۔"

بوڑھے نے یہ سب باتیں بہت لاتعلقی سے سنیں اور کہا،

"تم میرا ایک کام کردو۔ مجھے ایک بات بتادو۔"

"کیا بات ہے۔ پوچھو۔ معلوم ہے جنرل نالج میں سب سے زیادہ نمبر میرے آئے ہیں کلاس میں۔"

"کس چیز میں منّی؟"

"یہ... یہ ایک چیز ہوتی ہے۔ مطلب ایک سبجیکٹ ہوتا ہے۔ اس میں ساری باتیں آجاتی ہیں۔ جیسے کون سا پہاڑ سب سے اونچا ہے؟ کون سی ندی سب سے بڑی ہے اور بہت ساری باتیں۔ تم مجھ سے کوئی بھی سوال پوچھ کر دیکھ لو۔ مگر جلدی سے پوچھ لو۔ دیر ہوجائیگی تو ممی ڈانٹیں گی اور تمہارے پاس بیٹھا دیکھ لیا تو پاپا تو پٹائی ہی کردیں گے۔ اب جلدی

دل زور سے دھڑکا۔ یہی جنات بابا کا اصلی گھر ہے۔

داہنی سمت سے آواز آئی۔

"آج بہت دیر کی بیٹا۔"

ارے..... آدمی موجود ہے۔ اسے اتنی خوشی اس دن بھی نہیں ہوئی تھی جس دن انگلش والے ماساب نے "مائی کاؤ" لکھنے پر اسے 'ویری گڈ' دیا تھا۔ اس نے آدمی کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔ وہ جھونپڑی کے قریب درختوں کے پاس کہرے میں کھڑا تھا۔ اس نے غور سے دیکھا اس کا پھاوڑا اس کے ایک ہاتھ میں تھا جسے وہ زمین پہ ٹکائے ہوئے تھا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ انگوچھے کو کانوں پہ برابر کر رہا تھا۔ کہرے میں لپٹا، دھوتی کرتا انگوچھا پہنے یہ آدمی اسے حضرت خضر علیہ السلام کا نوکر لگا۔

"آدمی سلام" وہ چہک کر بولا۔

"جیتے رہو بیٹا۔ پنڈاری ساب کو ہماری رام رام کہنا۔ اندھیرا مت کیا کرو۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گھر آکر کھانا کھا کے دالان میں بیٹھی خالہ کے کلیجے سے لگ کر اس نے انھیں پورا واقعہ سنایا۔ وہ چاہتا تھا خالو اور خالہ کو علم ہو جائے کہ اسکول کی پڑھائی کے علاوہ راستے میں واپسی کے لیے اسے کیسی جوکھم اُٹھانا پڑتی ہے۔ مگر خالہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ والی بال کے میچ کے چکر میں اسے دیر ہوئی تو وہ ہمدردی کے بجائے الٹا اسے ڈانٹنے لگیں۔

رات کو دالان میں رضائی سے بدن اچھی طرح لپیٹ کر اس نے سوچا اگر وہ آدمی مر گیا تو میں اسکول سے کیسے واپس آیا کروں گا۔ پھر یہ سوچ کر مطمئن ہوا کہ وہ آدمی دیکھنے میں تو خالو سے بھی چھوٹا لگتا ہے، ابھی نہیں مرے گا۔

"سرفراز! تمہاری خالہ کی بیٹی کی شادی ہے۔ خالہ نے مجھے بُلا کر کہا کہ سرفراز تو ہمیں بالکل بھول گیا۔ تم اس سے جا کر کہو کہ خالہ اور خالو اسے دیکھنے کو بہت بے تاب ہیں۔ اسے شادی میں ضرور آنا ہے۔"

سرفراز کو یہ سن کر بہت ندامت ہوئی۔ وہ ندامت کے اس احساس کو چھپانا چاہتا تھا۔

سے پوچھ لو۔"

"منی" بوڑھے نے نیم دراز ہو کر بہت رازداری کے لہجے میں قریب آکر، اتنے قریب کہ بچی نے اس کے چہرے کی ساری شکنیں گن لیں۔ کہا۔

"مجھے یہ بتادو کہ میری عمر کتنی ہے اور میں کب مروں گا؟"

بچی کا ہاتھ بستہ پر جہاں رکھا تھا وہیں رکھا رہ گیا۔ اس کی نگاہیں بوڑھے کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ پھر اچانک وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

"واہ، یہ ہمیں کیا معلوم۔ یہ تو تمہارے ابا کو معلوم ہوگا کہ تمہاری کتنی عمر ہے۔ اور تم کب مروگے یہ اللہ میاں کو معلوم ہے۔"

کئی راہ گیر ان کے پاس آکر جمع ہوگئے۔

بوڑھے نے ان کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھا اور کہا:

"کوئی مجھے بتادے کہ میری عمر کتنی ہے اور میں کب مروں گا۔ یہ بچی نہیں بتا پارہی۔ تم بتادو بیٹے۔" اس نے ایک نوعمر لڑکے سے کہا جس کے ہاتھوں میں کرکٹ کا بلا تھا۔

وہ لڑکا آگے بڑھا، اس کے چہرے پر ذہانت جگ مگ جگ مگ کر رہی تھی۔

"بابا۔ جب آپ پیدا ہوئے.... نہیں نہیں۔ جب آپ چھوٹے تھے، تب کی کوئی بات یاد ہے؟ کوئی بہت ہی خاص بات اگر آپ بتادیں تو ہم آپ کو آپ کی عمر بتادیں گے۔"

"ہاں مجھے یاد ہے۔ اس وقت سب لوگ لڑ رہے تھے۔ کچھ لوگ ہار گئے تھے۔" بوڑھے نے سوچ کر کہا۔

"تو آپ پہلی جنگ عظیم کے وقت پیدا ہوئے ہوں گے۔ مگر آپ کی عمر تو سو سال سے کم معلوم نہیں ہوتی۔ آپ شاید کسی اور جنگ کی بات کر رہے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے حساب سے تو آپ ساٹھ پینسٹھ سال کے ہوں گے صرف"

لڑکے نے اپنا بلا چبوترے پر رکھ دیا اور وہیں بیٹھ گیا۔

"نہیں بیٹے۔" بوڑھے نے کہا۔ "پہلی جنگ عظیم تو کل کی بات ہے۔"

بھیڑ میں سے ایک جوان شخص آگے نکلا اور حساب لگا کر بتایا۔

"آپ کی عمر تقریباً ایک سو پچیس سال ہے۔ ۱۸۵۷ء کے واقعہ کو لگ بھگ اتنا ہی وقت بیت چکا ہے۔"

بوڑھے کے مٹیالے سے ہونٹ آہستہ سے کھلے۔ اس سے کچھ بولا نہیں گیا۔ پھر اس نے بہت دقت کے ساتھ کہا۔

"۱۸۵۷ء کی جنگ تو ابھی کا واقعہ ہے۔"

بھیڑ میں ایک سنسنی سی پھیل گئی۔ لیکن بوڑھے کے چہرے پر پھیلی ہوئی سنجیدگی نے سب کو مجبور کیا کہ کوئی اس پر شک نہ کرے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

اتنے میں بچی نے تاریخ کی کتاب کا ایک سبق یاد کیا اور اچھل کر بولی۔

"تم پورے ۲۲۳ سال کے ہو۔ پانی پت کی تیسری لڑائی ۱۷۶۱ء میں ہوئی تھی۔"

بوڑھے نے اپنا سر انکار میں ہلایا۔

بھیڑ میں چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ شام بڑھ رہی تھی اور سائے پھیلنے لگے تھے۔ لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔

سب نے اپنی اپنی معلومات کو کھنگالا۔ ایک ۳۵-۴۰ برس کے آدمی نے بڑھ کر کہا:

"بابا، آپ کی عمر ۴۲۸ برس ہے۔ اکبر نے ہیمو کو پانی پت کی دوسری جنگ میں ۱۵۵۶ء میں ہرایا تھا۔"

بوڑھے نے بہت مایوسی کے ساتھ اپنا سر نفی میں ہلایا۔

لوگ جنگوں کو یاد کرتے رہے اور حساب لگاتے رہے اور بوڑھے کو اس کی عمر بتاتے رہے۔ اور وہ اپنا سر نفی میں ہلاتا رہا۔

اتنے میں بھیڑ کو چیرتا ہوا بچی کو ڈھونڈتا ہوا اس کا باپ آگیا۔ اس نے بچی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھانا چاہا۔ بچی خوف زدہ نظر آرہی تھی، لیکن ہمت کر کے اس نے اپنے باپ سے کہا۔

"پاپا، ہم نے وعدہ کیا تھا کہ ہم ان کے سوال کا جواب دیں گے ورنہ اپنے پاپا سے کہیں گے۔ اب آپ آگئے ہیں۔ آپ ہی بتا دیجئے کہ ان کی عمر کیا ہوگی اور یہ کب مریں گے؟"

بچی کے شفیق باپ نے بچی کا ہاتھ چھوڑا۔ اب تک جو بیتا تھا، وہ لوگوں سے سنا اور

بوڑھے بابا کو غور سے دیکھ کر کچھ سوچا اور پھر بوڑھے کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔

تب بوڑھے نے پیوند لگے لبادے سے اپنے گھٹنے چھپائے۔ اتنے میں بھیڑ کے اندر سے ایک شخص نہایت اعتماد کے ساتھ باہر نکلا اور بولا۔

"ہو نہ ہو یہ آدمی سکندر اعظم کے وقت میں پیدا ہوا تھا۔"

اس دفعہ بوڑھے سے پہلے بچی کے باپ نے نفی میں سر ہلایا اور دوزانو ہو کر بوڑھے کے پاس بیٹھ گیا۔ اوپر سے نیچے تک بوڑھے کو دیر تک دیکھا اور پھر سر آگے کر کے اعتماد کے ساتھ آہستگی کے لہجے میں بوڑھے سے مخاطب ہو کر کہا۔

"بابا میں تمہاری عمر بتادوں اور یہ بتادوں کہ تم کب مرو گے؟"

بھیڑ میں سب کے چہرے چمکنے لگے۔ بچی کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ سب بہت اشتیاق کے ساتھ بچی کے باپ کو دیکھنے لگے۔

بچی کے باپ نے بہت محبت سے بوڑھے کے گھٹنوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے اور محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ کپڑوں پر نہیں، بوڑھے کے ننگے گھٹنوں پر ہیں۔ تب اس نے بھیڑ کے افراد کو فرداً فرداً دیکھا، چوراہے کو دیکھا، چاروں سمتوں میں جاتے ہوئے راستوں کو دیکھا، ہر طرف پھیلی ہوئی آبادی کو دیکھا اور سفاک آسمان کو دیکھا۔

"بابا۔" بچی کے باپ نے بہت واضح الفاظ میں کہنا شروع کیا:

"بابا تم ہمیشہ سے ہو اور اس دنیا میں کبھی نہیں مر پاؤ گے۔"

ننھی بچی، نو عمر لڑکا، جوان آدمی اور بھیڑ کا ہر فرد حیران ہوا جب انہوں نے دیکھا کہ اس بار بوڑھے کا سر اثبات میں ہلا تھا۔

منظر

منظر

(عرفان صدیقی کے نام)

ہم لوگ ظہر کے بعد گھر سے نکل پڑے تھے اور اب پل پر پہنچ چکے ہیں۔

بالکل اسی جگہ اسی پل پر کھڑے ہو کر میں نے اس دن سوچا تھا کہ خاموش اونٹوں کی قطار کے ساتھ رمضان کا قافلہ تھوڑی ہی دیر میں رخصت ہونے والا ہے۔ تین میل دور قصبے کی پرانی مسجدوں سے مغرب کی اذان کی آواز، راستے کی دھند میں لپٹے ہوئے گھنے درختوں میں کھوتی ہوئی ہم تک آئے گی اور ہم آخری روزہ افطار کریں گے پھر لڑکپن سے لے کر اب تک بیتے ہوئے ہر برس کی طرح اس پل سے اتر کر بے داڑھی کے غلام ماموں کو امام بنا کر رمضان کی آخری مغرب ادا کریں گے اور ٹیلے پر چڑھ کر نہر کے اس پار کھڑے شیشم کے درختوں کے اوپر عید کا چاند دیکھیں گے اور چاند دیکھ کر ہمیشہ کی طرح اپنی اپنی بندوق سے ایک ایک فائر کر کے عید کا استقبال کریں گے، پھر ذبح کئے ہوئے پرندوں کے تھیلوں کا بوجھ اپنی پیٹھ پر لادے، ٹھنڈی بندوقیں تھامے ہم لوگ واپس ہوں گے۔ واپسی پر ریتیلے دگڑے پر چلتے چلتے حامد اپنے کمزور ہاتھوں سے غلام ماموں کو بندوق تھما کر مجھ سے لپٹ کر خوشامدی لہجے میں کہے گا...

"کل آپ نے عیدی میں پورا ایک روپیہ نہیں دیا تو آپ میرے سب سے اچھے بھائی جان نہیں ہوں گے...."

میں اس کی پتلی مریل گردن کو آہستہ سے پنجے میں دبا کر مصنوعی خفگی دکھاتے ہوئے کہوں گا...

"تم اتنے تو کمزور ہو۔ اتنی سردی میں شکار کھیلنے کیوں آئے ہو؟"

"آپ بھی تو آتے ہیں..." وہ ضدی لہجے میں جواب دے گا۔

"ہم..... ہم تو بڑے ہیں بھئی۔ پھر ہم تو عید بقرعید سے ایک دن پہلے شکار ضرور کھیلتے ہیں مگر آپ کو یہ شوق ابھی سے کیوں سوار ہوا ہے۔ پہلے ذرا بڑے تو ہو جاؤ۔ کیوں؟....."

"نہیں بھائی جان! بس مجھے اچھا لگتا ہے..... دھائیں سے بندوق بولتی ہے۔ ہریل پھڑ پھڑاتا ہوا نیچے گرتا ہے۔ ایں بھائی جان اس کا وزن سچ مچ کم ہو جاتا ہے اگر زمین پر گرنے سے پہلے نہ لپک لو تو؟" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر میری آنکھوں میں حیرت سے جھانکتے ہوئے پوچھے گا...

لیکن..... اس دن یہ سب کہاں ہوا تھا۔ میں جیسے ایک دم جاگ پڑا...

میں نے سوچا...

اس دن بس سورج غروب ہی ہونے والا تھا اور پل کی کمر بھر اونچی فصیل پر سب نے تھیلوں سے افطاری نکال کر رکھ لی تھی...

اور نماز کے بعد سب سے پہلے حامد نے دعا ختم کی تھی۔ وہ بھاگتا ہوا، ریت اڑاتا، جھاڑیوں سے الجھتا ہوا ٹیلے پر چڑھ گیا تھا۔ ہم لوگ بھی تیز تیز سانسوں کے ساتھ ٹیلے پر چڑھ گئے تھے۔ موسم صاف تھا۔ غلام ماموں سب سے آخر میں چڑھ پائے۔ تیس روزوں کے بعد عید تو یقینی تھی لیکن چاند دیکھنے کے شوق میں غلام ماموں نے اپنے بھاری بدن کی پروا بھی نہیں کی تھی۔ پھولتی ہوئی سانسوں کا بوجھ ہمارے کندھوں پر ڈال کر انھوں نے پوچھا تھا۔

"پچھلے سال کدھر دیکھا تھا؟"

"ادھر"..... عزیز بھائی کی آواز سن کر ہم سب نے نگاہیں ان کی انگلی کی سیدھ میں نہر کے اس پار کھڑے شیشم کے درختوں کے اوپر آسمان پر دوڑائیں۔

وہاں کچھ بھی نہیں تھا!!!

نہر کے اس پار، شیشموں کے اوپر آسمان میں کچھ بھی نہیں تھا!! کچھ پرندے واپسی کی پرواز کرتے ہوئے ہمارے سامنے سے ہو کر نکلے۔ وہ پرندوں کی آخری قطار تھی

کیوں کہ آسمان اب مٹیالا ہونے لگا تھا اور نہر کے پانی کے آواز میں گہری بے چین سرسراہٹیں بولنے لگی تھیں۔

"موسم تو بالکل صاف ہے۔ چاند کیوں نہیں دکھائی دیتا؟" غلام ماموں نے بہت عجیب سی آواز میں کہا۔

"چاند..... کدھر ہے بھائی جان؟" حامد میری کمر پکڑ کر مجھ سے قریب ہو گیا۔

"عید تو کل ہونا ہی ہے۔ آج کا چاند تو تیسا تھا....." جمال نے ہولے سے کہا تھا۔

"تھا" سن کر میں نے اپنی ٹانگوں میں کپکپاہٹ محسوس کی جیسے آج کا چاند ماضی کے گہرے پانیوں میں، ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا ہو...

چھوٹے سے ٹیلے پر کھڑے ہم پانچوں انسانوں کو مجید بھیا کی آواز نے سہارا دیا...

"ادھر بھی تو دیکھو... چاند ہر سال جگہ بدل دیتا ہے..."

مجید بھیا اوپر نہیں آئے تھے...

ٹیلے پر کھڑے کھڑے ہم نے حد نظر تک پھیلے ہوئے منظر کو دیکھا۔ دور کھیتوں میں دھواں سا اٹھ رہا تھا اور ان کے پیچھے اندھیرے میں سماتے ہوئے آم کے باغات تاریک ہوتے جا رہے تھے۔ درختوں کے سائے میں آہستہ آہستہ نہر بہہ رہی تھی افق دھندلا ہو چکا تھا اور شیشموں کے اوپر آسمان میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اور کسی بھی طرف آسمان میں کچھ نہیں تھا۔

"کیا نہیں دکھائی دیا؟....." مجید بھیا نے پوچھا تھا۔

اوپر کھڑے پانچوں انسانوں نے خوف کی لہروں کو اپنے بدن پر مکڑی کے جالوں کی طرح لپٹتا ہوا محسوس کیا۔ ہم سب کے دل بہت زور زور سے دھڑک رہے تھے جیسے کچھ ہونے والا ہے اور اسی لمحے سب نے سوچا کہ جس نے بھی مجید بھیا کی بات کا جواب دیا اس کا دل پھٹ جائے گا۔ ہم سب خاموش تھے کہ غلام ماموں نے بڑی ہمت کر کے کہا...

"ایسا تو کبھی نہیں ہوتا تھا۔ کیا..... ہمارے یہاں بھی کچھ ہونے والا ہے؟"

حامد نے میری کمر مضبوطی سے پکڑ لی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"ایسی باتیں مت کیجئے غلام ماموں..... ہمارے ساتھ بچہ ہے ڈر جائے گا۔ ہم لوگ گھر سے دور ہیں۔ گھر واپس چلئے..."

میں نے بڑی مشکل سے کہا۔

اسی وقت ہوا ایک دم سے چل پڑی اور ہم لوگ ایک دوسرے کے قریب آگئے تھے۔

اسی وقت جمال بولے تھے۔

"میاں نے پہلے ہی منع کیا تھا کہ رمضانوں میں شکار مت جایا کرو..."

پھر جیسے انھیں خیال آیا کہ اس جملے سے سب پر ان کا خوف ظاہر ہو گیا ہے...

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے..... یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ افطار کرنے کے بعد پیاس کی شدت سے کوئی ایک دم نہر کی طرف بھاگے اور لڑکھڑا کر نہر میں گر پڑے اور ڈوب جائے۔ معلوم ہے کتنی گہری ہے نہر...؟"

مجید بھیا نیچے سے اوپر آتے ہوئے مسلسل ہمیں تک رہے تھے جیسے ہماری تلاش کرتی ہوئی آنکھوں میں انھوں نے ساری تحریر پڑھ لی ہو۔

میں نے حامد کو مضبوطی سے پکڑ کر اس کی پیٹھ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تھپتھپائی تھی اور مجید بھیا نے سیدھے کھڑے ہو کر شیشموں کے اوپر دیکھا تھا۔ دیکھتے رہے تھے۔ پھر انھوں نے ہم سب کو دیکھا تھا۔ ہم سب ایک دوسرے کو دیر تک دیکھتے رہے تھے۔

اور اسی وقت نہر کے پانی میں کوئی مچھلی تڑپ کر اچھلی تھی۔ حامد اور زیادہ سہم گیا تھا اور پھر..... اچانک چلایا تھا.....

"وہ کیا..... ارے..... ارے..."

"کیا بات ہے حامد میاں..... کیا ہے..... بولو بیٹے....." غلام ماموں گھبرا کر بولے تھے ..."کیا چاند دکھائی دیا؟"

"نہیں..... نہیں..... اوپر نہیں۔ نہر کے ادھر شیشموں کے نیچے دیکھئے دو پیڑوں کے بیچ میں ایک گھر سا بنا ہوا ہے....." حامد بھرائی ہوئی آواز میں چلایا تھا...

ہم نے ادھر دیکھا.... اور جب.... ہم نے حامد کی بتائی ہوئی جگہ پر غور سے دیکھا تھا .... تو.... وہ منظر.... اُف....

اس وقت ہوائیں تیز ہوئیں اور ہمارے ڈھانچوں سے ٹکرائیں۔ ہمارے ڈھانچے ساکت کھڑے رہے اور ہڈیاں آپس میں ٹکرا ٹکرا کر بجنے لگیں۔ آنکھوں کے حلقے اتنے پھیل گئے کہ آنکھیں بند ہونا بھول گئیں۔ سانسیں خاموش ہو گئیں۔ پورے ماحول پر اندھیرے میں لپٹا ہوا وہ خوف مسلط ہو گیا تھا جو زندگی کے کئی برس ایک ساتھ کھا گیا۔ پھر بے ہوش حامد کو کاندھے پر لادے ہوئے جب ہم قصبے میں داخل ہوئے تو عشاء کی نماز ہو چکی تھی۔ سڑک کی لالٹین کی دھندلی روشنی میں دو دو چار چار کی ٹکڑیوں میں کھڑے ہوئے لوگ بڑے فکر مند لگ رہے تھے، وہ سب ہمیں بہت اجنبی لگ رہے تھے۔ پورا قصبہ ایک بے سکون اداسی میں ڈوبا ہوا آہستہ آہستہ سرگوشیاں کر رہا تھا۔

ایک لالٹین کے قریب سے گزرتے ہوئے ہم نے سنا تھا....

"ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ تیسا بھی نظر نہ آیا ہو...."

"کل عید تو ہو گی کہ نہیں؟"

"وہ تو ہو گی ہی.... لیکن ذرا سوچو.... کیسی عجیب بات ہے کہ...."

چھوٹی بازار کے نکڑ پر کھڑے شریف چچا لوگوں کو آہستہ آہستہ ایک ایسی آواز میں سمجھا رہے تھے جو ان کی اپنی آواز نہیں تھی....

"ایک بار تو انھوں نے چاند کے دو ٹکڑے کئے۔ پھر ایک دن جب مولیٰ علی کی نماز قضا ہو گئی تو سورج...."

"پر چچا مجھے تو لگے کہ حج پہ جو خون بہا ہے یہ اسی کا نتیجہ ہے...."

"اجی ہم سب آپس میں ہی کٹے پڑ رہے ہیں...."

سب کی آوازیں جاڑے کی ہواؤں کے ساتھ بکھر رہی تھیں۔ ٹوٹ رہی تھیں....

ہم اندھیری سڑکوں پر آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ تکان سے ہم سب لوگ بوجھل ہو چکے تھے۔ بے ڈھنگے پن سے بندوقیں اٹھائے گھر کی طرف بڑھتے ہوئے ہم لوگ صرف یہ سوچ

رہے تھے کہ جس وقت ہم گھر کے اندر داخل ہوں گے تو کیا گھر والے ہمیں اجنبی تو نہیں سمجھیں گے۔

موڑ پر کسی نے بہت سرگوشیوں والے انداز میں اپنے پاس کھڑے شخص سے کہا تھا....

"دیکھو میں نے اسی دن کتاب میں دکھایا تھا کہ جب چودھویں صدی....."

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا....."

"آج تو بدلی بھی نہیں تھی....."

پھر ہم لوگ اپنے اپنے گھروں میں یوں داخل ہوئے جیسے نئی بستیوں میں آرہے ہوں جہاں کی زبان ہمارے لئے اجنبی ہو۔ جب بہت دیر کے بعد ہم لوگ اپنے اپنے حواس میں آئے تو جو کچھ گزرا تھا سب کو بتایا لیکن وہ منظر بتاتے وقت مجھے پھر ایسا لگا جیسے میرے بدن کا گوشت گلنے ہی والا ہے اور ہڈیاں ٹکرا ٹکرا کر بجنے ہی والی ہیں۔ سب نے مجھے خاموش کر دیا تھا۔

دوسرے دن عید کی نماز پڑھتے وقت یوں محسوس ہوا جیسے کسی کی نماز جنازہ ادا کر رہے ہوں۔ پھیکی پھیکی مسکراہٹوں کے ساتھ لوگوں سے گلے مل کر ہم سب نے شریف چچا کو پورا واقعہ سنایا تھا۔ سب کچھ سُن کر وہ چپ ہو گئے تھے۔ وہ بہت دیر تک خاموش بیٹھے رہے تھے اور جب ان کی خاموشی بھی ڈراؤنی لگنے لگی تو غلام ماموں نے کہا تھا....

"شریف چچا، تم تو پرانے شکاری ہو۔ برسوں نہر پر شکار کھیل چکے ہو۔ تم تو مچھلی کا شکار بھی کھیلتے تھے۔ تم بتاؤ.... کیا شیشم والی پانتی میں کوئی ہے؟....."

شریف چچا نے خاموشی سے یہ سوال سن کر ہولے سے کہا تھا....

"صرف ایک دفعہ.... مجھے وہاں کچھ نظر آیا تھا۔ یہ تب کی بات ہے جب نورالدین کو لڑائی کی وجہ سے عرب کی نوکری چھوڑ کر آنا پڑا تھا۔ اس نے آنے کے دوسرے ہی دن مجھ سے کہا تھا کہ ابا اب ہم لوگ یہیں کوئی کام کریں گے۔ اگر نہر کے درختوں کا ٹھیکہ لے لو تو آرا مشین لگا کر کام شروع کر دیا جائے۔ تو میں اور نورالدین دونوں نہر کے درخت

اس نے سنجیدہ لہجے لیکن کھو کھلی آواز میں انوار کو بتایا کہ سرکاری ملازمت خصوصاً ذمہ داری کے عہدے پر کام کرنے میں بالکل فرصت نہیں ملتی۔ پھر اسے عائشہ کی یاد آئی، جسے اس نے اپنی گود میں کھلایا تھا۔ وہ کتنی جلدی اتنی بڑی ہو گئی۔

"شادی کب ہے؟"

"پرسوں بارات آئے گی۔"

"ارے۔ ان حالات میں تاریخ کیوں رکھ دی خار نے۔ تم نے دیکھا نہیں، کیسے دیوانے ہو رہے ہیں سب، لال بھبھوکا چہرے لیے ٹرکوں اور ٹریکٹروں پر جلوس نکال رہے ہیں۔ ہاتھوں میں ہتھیار اور کیسے نفرت انگیز نعرے....."

انوار اسے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

"میں نے بھی خار سے کہا تھا کہ آج کل تقریب کرنے والا وقت نہیں ہے۔ گاؤں گاؤں میں وہ بات پھیل گئی ہے۔ خود انھیں کے گاؤں میں لوگوں کے لہجے بدل گئے ہیں۔ مگر خار کی بھی مجبوری ہے۔ خالو کے بھائی کے بیٹے سے رشتہ طے ہوا ہے جو تین دن بعد جدہ واپس چلا جائے گا۔ خالو بھی اب بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ اپنے سامنے عائشہ کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔ تمھیں آج ہی چلنا ہوگا سرفراز۔ بھابھی کو فون کر کے تیار ہونے کو کہہ دو۔"

"کیا تم نے اخبار نہیں پڑھا انوار؟ پرسوں ریل گاڑی سے اتار کر....." وہ چپ ہو گیا۔

انوار بھی خاموش ہو گیا۔ پھر بولا۔

"اچھا تو بھابھی اور بچوں کو یہیں رہنے دو۔"

"ہاں۔ ان لوگوں کو نہیں لے جاؤں گا۔"

"گیارہ بجے ہیں..... اگر بارہ بجے بھی کار سے چلیں تو شام چھ سات بجے تک خار کے ہاں پہنچ جائیں گے۔"

"ہاں۔ تقریباً ڈھائی تین سو کلومیٹر کا سفر ہے۔"

راستے میں نہر کے پُل پر اچانک کچھ لوگوں نے گاڑی کے سامنے آکر گاڑی روکنے کا اشارہ کیا۔ دونوں کے دل بیٹھ گئے کیونکہ بچاؤ کے لیے ان کے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا۔

دیکھنے گئے تھے۔ ہم لوگ جب شیشمیں دیکھ کر واپس آ رہے تھے تو پل پر آ کر نورالدین نے کہا تھا کہ اس پل سے لے کر دوسرے پل تک ساری شیشموں کا ٹھیکہ کتنے میں ملے گا، کچھ اندازہ ہے ابا؟ تو میں نے اندازہ کرنے کے لئے جب مڑ کر شیشموں کی پاشتی کی طرف دیکھا تو..... تو اس دن جو کچھ مجھے نظر آیا وہ بتاتے ہوئے مجھے آج بھی ڈر لگنے لگتا ہے۔ میں نے آج تک نورالدین کو بھی نہیں بتایا لیکن مجھے نورالدین نے بتا دیا تھا۔ اور تمھیں یقین نہیں آئے گا جو نورالدین نے دیکھا وہ میں نے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے کچھ اور دیکھا تھا....."

"یہی بات ہے چچا..... ہم لوگوں نے بھی الگ الگ چیزیں دیکھی تھیں..... بس حامد نہیں بتاتا کہ اس نے کیا دیکھا....."

"کیا کہتا ہے وہ؟"

"وہ کہتا ہے اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ اس پر میں نے کہا کہ تمھیں نے تو سب سے پہلے اشارہ کیا تھا کہ ادھر نہر کے پار شیشم کے دو درختوں کے بیچ کچھ گھر جیسا بنا ہوا ہے۔ وہاں بھلا گھر کہاں سے آجائے گا تو اس پر وہ کہتا ہے کہ ہاں بس ایک گھر نظر آیا تھا۔ وہ اور کچھ نہیں بتاتا۔ ڈر گیا ہے۔ بالکل چپ ہو جاتا ہے۔ زیادہ پوچھو تو رونے لگتا ہے۔ لیکن..... شریف چچا....."

شریف چچا نے پلکیں اوپر اٹھائیں۔ ان کا چہرہ زرد ہو گیا تھا.....

"تم نے کیا دیکھا تھا چچا....." میرے بجائے جمال بولے تھے.....

"میں سمجھ رہا تھا تم یہی پوچھو گے۔ جو کچھ میں نے دیکھا تھا وہ اگر تمھیں بتا دوں تو یقین کر لو گے.....؟" وہ کچھ دیر خاموش رہے تھے۔

"تب مجھے میاں نے منع کر دیا تھا کہ کسی کو کچھ نہ بتاؤں لیکن اب بہت دن بیت چکے ہیں اور تمھیں بھی نہر پر کچھ نظر آیا ہے اس لئے آج بتا رہا ہوں..... لیکن کیسا عجیب لگتا ہے یہ سوچ کر کہ ہم نے الگ الگ منظر دیکھا تھا۔ سنو نورالدین نے دیکھا تھا کہ نہر کی پٹری پر یہاں سے وہاں تک تیل کے کنویں کھدے پڑے ہیں اور ان کنوؤں میں ایک ساتھ

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

آگ لگ گئی ہے اور آگ کی لپٹیں اتنی اونچی ہیں جیسے آسمان سے زمین پر برس رہی ہوں اور ان آگ کی لپٹوں کے ساتھ جابجا جلتے ہوئے لمبے لمبے عمامے فضا میں لہرا رہے ہیں اور یا حبیبی.... یا حبیبی کی بے چین صدائیں چاروں طرف گونج رہی ہیں۔ چند لمحوں تک یہ منظر اس نے دیکھا اور جب میں نے نورالدین کی آنکھوں کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں مردے کی آنکھیں لگ رہی تھیں....

شریف چچا سانس لینے کو رکے تھے اور پھر ہم سب کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے تھے...

"تمہیں معلوم ہے میں نے کیا دیکھا تھا۔ میاں کے علاوہ آج پہلی بار سب کو بتا رہا ہوں۔ اس دن تمہاری چچی کو گذرے قریب ایک مہینہ بیت چکا تھا۔ مرنے سے پہلے مرحومہ کئی بار مجھ سے کہہ چکی تھیں کہ لاہور میں ان کے بھائی کو خط لکھ دوں کہ اب کی مرتبہ جب بزنس کے سلسلے میں ڈھاکہ جانا ہو تو کسی آتے جاتے کے ہاتھ ململ کا ایک تھان ہندوستان بھیج دیں۔ بہت دن سے مہین کرتے نہیں پہنے ہیں جب میں نے تمہاری چچی کو بتایا کہ کچھ دن ہوئے ڈھاکہ پاکستان سے الگ ہو گیا ہے اور اب پاکستان والے وہاں نہیں جاتے تو یہ سن کر ہذیانی انداز میں زور زور سے چلانے لگی تھیں۔ جب میں نے انھیں پوری صورت حال سمجھائی تو وہ ایک دم کھل کھلا کر ہنسی تھیں اور پھر چپ ہو گئی تھیں۔ دوسرے دن سے ان کی کھانسی کے دورے تیز ہو گئے تھے۔ شام کو میرے پاس آکر میرے سینے پر سر رکھ کر چپکے چپکے بولی تھیں کہ یہ سوچ سوچ کر ہمیشہ خود کو خوش کر لیتی تھی کہ لاہور والے بھائی جان ڈھاکہ والے رشتہ داروں کے پاس جا کر ململ کے تھان لے کر کسی آتے جاتے کے ہاتھ ہمیں ہندوستان بھیج دیں گے تو ہم سفید اجلے کرتے پہن کر پڑوس کے پنڈت کی بیوی سے کہیں گے کہ بی پڑوسن ہمیں اچھے کپڑوں کی کیا کمی۔ ڈھاکہ اور لاہور کے عزیز سلامت جو ہمیں ململ خرید کر بھیج دیتے ہیں۔ لیکن.... جب کل تم نے بتایا کہ اب لاہور اور ڈھاکے میں رشتہ نہیں رہا ہے تو میں نے سوچا کہ یہیں بازار سے کپڑے خرید لیں گے۔ تمہاری چچی نے پلنگ سے اٹھ کر مجھے جو کپڑے دکھائے وہ

کھادی کے کرتے تھے۔ سفید، ہرے، نیلے اور گیروے رنگ کی کھادی.... اور یہ کرتے دکھا کر وہ پھر ہنسنے لگی تھیں۔ کچھ دن بعد وہ ایک رات گیروے رنگ کا کرتا پہن کر سوئیں۔ میں انہیں دوا پلا کر اپنے بستر پر آکر سو گیا۔ صبح فجر کے وقت میں نے انھیں جا کر جگایا تو وہ نہیں جاگیں ان کی آنکھیں آدھی کھلی ہوئی تھیں اور ململ کی طرح سفید تھیں۔ اور اب تم سنو کہ اس دن میں نے نہر پر کیا دیکھا تھا..... اس شام سورج غروب ہو رہا تھا کہ نورالدین کے کہنے پر میں نے نہر کی پٹری پر شیشموں کی طرف دیکھا تو دیکھا کہ نہر کی پٹری پر تمھاری چچی کھڑی ہیں۔ وہ بالکل جوان ہیں جیسی اپنے گھر سے آئی تھیں۔ تمھاری چچی اوپر سے نیچے تک ململ کا تھان لپیٹے ہوئے ہیں اور مسکراتی ہوئی دونوں ہاتھوں سے اپنا لباس تھامے میری طرف چلی آرہی ہیں کہ اچانک نہر سے لمبے لمبے ناخنوں والے بڑے بڑے بہت سے ہاتھ باہر نکلے اور تمھاری چچی کے بدن سے کپڑے چھیننے لگے۔ وہ وحشت زدہ کھڑی دیکھتی رہیں۔ ان ہاتھوں نے ململ کا تھان اتار کر نہر کے دوسرے کنارے پر ڈال دیا اور تمھاری چچی بالکل بے لباس ہو گئیں۔ بے لباس کھڑے کھڑے انھوں نے تھوڑی دیر تک کچھ سوچا اور پھر زمین سے ایک کپڑا اٹھا کر اپنے بدن پر پہن لیا۔ وہ گیروے رنگ کا کرتا تھا۔ تمھاری چچی لمبا کرتا پہن کر ایک دم زور سے کھل کھلا کر ہنسیں اور پھر اس قدر مطمئن ہو گئیں کہ میں اس خوف اور تحیر کے عالم میں بھی چونک پڑا۔ بس اسی وقت میں نے نورالدین کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ مردے جیسی نظر آرہی تھیں...."

شریف چچا جب خاموش ہوئے تو ہم اپنے دل کی دھڑکنیں واضح انداز میں سن رہے تھے۔

اسی وقت غلام ماموں نے بیٹھک کا دروازہ کھولا تھا۔ سرد ہوا کا جھونکا اندر آیا تھا، تھوڑی دیر ٹھٹھکا تھا اور خاموشی سے واپس چلا گیا تھا۔

جمال نے دروازہ بند کیا تھا اور واپس آکر پوچھا تھا.....

"یہ کیا بھید ہے شریف چچا.....؟"

"معلوم نہیں بیٹے۔ میرا دماغ کام نہیں کرتا۔ میاں سے پوچھا تو وہ خاموش ہو گئے تھے....."

"لیکن چچا ہم تو بچپن سے نہر پر شکار کھیل رہے ہیں۔ یہ خوف تو ہم سے ہمارا شوق بھی چھین لے گا کیا نہر پر کوئی بری روح آ گئی ہے۔؟"

"کیا خبر..... لیکن اب تم سب جا کر میاں سے کہو۔ وہی کچھ کریں گے....."

شام کو ہم سب میاں کے حجرے میں حاضر ہوئے تھے۔ اگر بتی کی خوشبو نے ماحول کو بوجھل بنا دیا تھا۔ میاں نے پوروں پر وظیفہ ختم کیا اور سفید پاکیزہ داڑھی سینے سے لگلی اور تھوڑی دیر کے بعد جب اپنی نرم آنکھیں کھولی تھیں تو ہم سب نے اپنے آپ کو بہت محفوظ محسوس کیا تھا.....

تب میاں نے ٹھہری ہوئی آواز میں دھیمے سے کہا تھا.....

"صحابہ کے حلقے میں بیٹھے ہوئے سرور کائنات نے فرمایا تھا اے لوگو! جو مجھے معلوم ہے اگر تمھیں اس کی خبر ہو جائے تو کبھی ہنسنے کی ہمت بھی نہ کرو....."

میاں نے یہ کہہ کر اپنے آنسو خشک کر کے پوچھا تھا.....

"تم لوگوں کو معلوم ہے کہ حضور کو کیا کیا معلوم تھا۔؟"

ہم سب خاموش رہے۔ وہ سوال کر کے جواب خود ہی دیتے تھے۔ ہم سب ان کے جواب کے منتظر تھے لیکن جب وہ خاموش رہے تو ہم سب بے چین ہوئے۔

"میاں!..... حضور کو کیا کیا معلوم تھا؟....." مجید بھیا نے ہمت کی تھی۔

میاں پھر بھی نہیں بولے تھے۔

اگر کا دھواں ہمارے سروں پر گاڑھا ہو رہا تھا اور خاموشی اس سے بھی زیادہ گاڑھی ہو چکی تھی۔

میاں آہستہ آہستہ رو رہے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے آنکھیں اٹھا کر مجید بھیا کو مخاطب کیا تھا.....

"کیا نظام علی کا پوت ہے؟....."

"جی ہاں..... میں ہوں مجید....." مجید بھیا نے جواب دیا تھا۔

پھر میاں نے کہا تھا.....

"مجھے بھی نہیں معلوم ہے کہ انھیں کیا کیا معلوم تھا لیکن ربِ علیم کی قسم انھیں ہر چیز معلوم تھی۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ اگر سب کو ہر چیز معلوم ہو جائے تو کبھی کوئی ہنسنے کی ہمت بھی نہ کرے۔ اس خرابے کی ساری خرابیاں ان پر روشن تھیں۔ اس خرابے کے چاروں طرف جو کائنات ہے اس میں ہر جگہ دکھوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ ہم میں سے جو صاحب توفیق ہیں وہ دکھوں کے اس ڈھیر پہ بیٹھے دکھی نگاہوں سے دکھ کا اتنا بڑا تماشہ دیکھ رہے ہیں لیکن ہم دکھوں کی ماہیت سے انجان ہیں صرف صورت آشنا ہیں۔ وہ ان سب کی ماہیت سے بھی واقف تھے، تبھی تو کہا تھا کہ جو کچھ مجھے معلوم ہے وہ اگر سب لوگ جان لیں تو پھر کبھی کوئی نہ ہنسے۔"

میاں کچھ دیر خاموش رہے تھے اور پھر بہت بھاری آواز میں کہا تھا.....

"تم سب لوگ جان لو کہ اب تمھاری دنیا میں دکھ بہت پیچیدہ ہو گئے ہیں ورنہ نہر پر تمھیں وہ منظر نظر نہ آتے۔ عید کا چاند محنت اور بندگی کا انعام ہوتا ہے۔ تمھاری محنت اور بندگی نامقبول ہوئی ورنہ چاند کیوں نہ دکھائی دیتا۔ ہم سب کے روزے گزرے ہوئے کل کی شام کو زمین و آسمان کے درمیان معلق رہے ہوں گے اور دعا کرتے ہوں گے کہ اے خدا اشرف المخلوقات کو ان کا انعام دے۔ انھیں چاند کا دیدار دے تو وہ صدقہ دیں اور ہم تیری بارگاہ میں مقبول ہوں۔ لیکن..... خدا نے ہم میں سے کسی کو چاند کا دیدار نہیں دیا۔ ہمارے روزے درمیان میں معلق ہیں....."

مجھے حجرے کے نیم تاریک ماحول میں بیٹھے بیٹھے نظر آیا جیسے صحرا میں اونٹوں کا طویل قافلہ چلا جا رہا ہو اور کسی بڑے دشمن کے نیزہ بردار سپاہیوں نے تیز اور لمبے نیزوں سے اونٹوں کی گردنوں کو چھید دیا ہو اور زخمی اونٹ بلبلا بلبلا کر چیخ چیخ کر تڑپ رہے ہوں۔

اسی وقت میاں نے میری طرف نظر کر کے فرمایا تھا۔

"شاہد! تمھیں کچھ کہنا ہے؟....."

میری زبان کھلنے سے پہلے ہی غلام ماموں نے کہا تھا....

"میاں! مجھے سب کی طرف سے عرض کرنا ہے کہ ہم ہمیشہ سے نہر پر شکار کھیلتے ہیں، اگر یہ خوف ہم پر مسلط رہا تو ہمارا شکار چھوٹ جائے گا۔ اور ہم لوگوں کا شوق ہی کیا ہے۔ کیا یہ بھی..... چھوڑ دیں؟ بستی کے سارے لوگ آپ سے پوچھ چکے ہیں۔ آپ انھیں یہ کیوں نہیں بتاتے کہ چاند کیوں نہیں نکلا۔ آپ ہمیں یہ کیوں نہیں بتاتے کہ نہر پر ہمیں وہ منظر کیوں دکھائی دیئے۔ میاں! اگر آپ بھی خاموش رہے تو پھر ہمیں اور کون بتائے گا؟ ہم لوگ کس کے پاس جائیں گے؟"

غلام ماموں کے خاموش ہونے پر میاں نے تھوڑی دیر ان کی طرف دیکھا تھا اور پھر سب کو باری باری دیکھ کر آہستہ آہستہ بولے تھے....

"غلام! سارے دکھوں کا اکیلا وارث میں نہیں ہوں۔ ساری امت کے حصے میں دکھ تقسیم کئے گئے ہیں بلکہ سب بندوں کو حصہ ملا ہے۔ اپنے دکھوں کو خود اپنے آپ پہچانو۔ جاؤ نہر پر جاؤ۔ اسی جگہ بیٹھ کر اپنے اپنے منظر یاد کرو اور پھر سوچو کہ تمھیں وہ منظر کیوں دکھائی دیئے۔ میں اب کمزور ہو چلا ہوں۔ مجھ پر اتنا بار نہ ڈالو۔ کل ظہر کے بعد نہر پر جانا۔ اب تم لوگ جاؤ۔ رات زیادہ ہو گئی ہے...."

ہم سب نے میاں کے اجلے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور اٹھ کھڑے ہوئے.....

"اور سنو...."

ہم سب پلٹ پڑے تھے....

"کل اپنے ساتھ حامد کو بھی لے جانا۔ بس اب تم جاؤ خدا تم سب کو سکون دے....."

ہم لوگ جب حجرے سے نکلے تو آسمان صاف تھا اور ستارے بہت روشن تھے۔ ہم لوگوں کے لمبے لمبے سائے میاں کے حجرے سے دور ہو رہے تھے۔ مڑ کر دیکھا تو سفید پوش میاں حجرے کے دروازے پر کھڑے ہمیں جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے اور اسی وقت اجنبی آسمان کے نیچے چلتے چلتے ہم سب نے شاید ایک ساتھ سوچا تھا کہ خدا جانے کل کیا ہوگا....

دوسرے دن ظہر کے بعد ہم لوگ نہر کی طرف چل پڑے تھے۔ نہر کے پل پر کھڑے

ہو کر میں نے سوچا کہ پرسوں اسی جگہ کھڑے ہو کر میں نے سوچا تھا کہ اونٹوں کے قافلے کے ساتھ رمضان اب رخصت ہونے ہی والے ہیں۔

عزیز بھائی نے پیچھے سے آکر میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا تھا.....

"آج دن میں بھی ڈر لگ رہا ہے۔ کیا تمھیں بھی ڈر لگ رہا ہے؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"یہ حامد کہیں زیادہ نہ ڈر جائے۔" عزیز بھائی نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں ہم لوگ اسے بہلائے رکھیں گے۔" جمال ہم لوگوں کے قریب آگئے تھے۔

اب میں نے نہر کے پل کے بالکل درمیان میں کھڑے ہو کر دور دور تک دیکھا۔ نہر کے چاروں طرف ایک سبز تصویر پھیلی ہوئی تھی جس میں کہیں کہیں مٹیالے دھبے نظر آرہے تھے کہ کچھ کھیت ابھی بونے سے رہ گئے تھے۔ گیہوں کے چھوٹے چھوٹے پودوں پر دھوپ نے چمک پیدا کر دی تھی۔ جہاں جہاں سایہ تھا وہاں کھیتوں کی سبزی گہری ہو گئی تھی اور کھیت بہت گنجان لگ رہے تھے..... اور تھوڑی دیر بعد چھوٹے ٹیلے پر بیٹھے ہم چھ افراد نے محسوس کیا کہ آج ہم یہاں اپنے اپنے فیصلے کرنے آئے ہیں یہاں ہم لوگ یہ سوچنے آئے ہیں کہ ہماری زندگی میں وہ کون سی کجی آگئی ہے جس کی وجہ سے معمولات نے اپنی راستی چھوڑ دی ہے۔

میاں نے کہا تھا کہ زمین پر پاؤں مارنے سے جو دھمک پیدا ہوتی ہے اس کے نہایت معمولی سے ارتعاش سے بھی کائنات کا کوئی نہ کوئی عمل ضرور متاثر ہوتا ہے۔ ہر قدم اہم ہے۔

سردیوں کا سورج اوپر تھا اور نیچے ہم لوگ تھے، تب غلام ماموں نے ٹیلے پر کھڑے ہو کر نہر کے پار اس جگہ کو غور سے دیکھا۔

شیشم کے دو بوڑھے درختوں کے درمیان کچھ بھی نہیں تھا جس سے خوف محسوس کیا جاسکے۔ سامنے نہر کے کنارے دور تک درختوں کا سلسلہ چلا گیا تھا اور ان میں سے کسی بلند شیشم کے اوپر سے بڑی فاختہ کی "یا حق تو" "یا دوست تو" کی مسلسل صدائیں اس

کنارے پر بالکل صاف سنائی دے رہی تھیں اور اب غلام ماموں نے سوچا کہ جو دن میں سوچو رات کو وہی خواب میں نظر آتا ہے پرسوں شام میں نے جو منظر دیکھا تھا وہ کسی بھیانک سوچ کا نتیجہ رہا ہوگا شاید اسی لئے میاں نے ہم لوگوں کو نہر پر بھیجا ہے کہ ہم لوگ اپنا منظر یاد کریں اور اس منظر کی گانٹھ کا وہ سرا تلاش کریں جس سے ہماری پچھلی سوچیں جڑی ہوئی ہیں۔

"کیا میں بتاؤں جو میں دیکھا تھا....." جمال نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"نہیں..... رکو..... پہلے خوب اطمینان سے سوچو کہ تم نے کیا دیکھا تھا پھر سوچو کہ تم نے وہ کیوں دیکھا۔ پھر بتانا....."

"کیوں دیکھا۔" جمال نے حیرت سے کہا۔ "کیا کوئی اپنے اختیار میں تھا یہ۔ آپ تو غلام ماموں بات کو اور بھی پیچیدہ بنا رہے ہیں....."

تبھی غلام ماموں نے میاں کے لہجے میں ہم سب سے مخاطب ہو کر کہا.....

"تم سب لوگ یہیں خاموش بیٹھے بیٹھے سوچو۔ میاں نے یہی کہا تھا۔ ان کی یہی ہدایت تھی کہ کوئی اپنا منظر نہ بتائے صرف حامد بتائے گا کہ اس نے کیا دیکھا تھا....."

یہ کہہ کر غلام ماموں نے سر نیچے ڈال لیا۔

اور اب غلام ماموں نے سوچا کہ سامنے ان دونوں درختوں کے بیچ وہ کیسا دہشت ناک منظر تھا۔ اف..... کہیں سچ مچ ایسا ہو جائے تو کیا ہوگا۔ اماں نے کتنے دکھ سہہ کر مجھے پالا کھجور کی گٹھلیوں کی چھالیا کھا کھا کر انھوں نے اپنے گردے میں پتھری پیدا کر لی لیکن میری پڑھائی کی طرف سے کبھی غفلت نہیں برتی۔ میں بینک کر کے ریلوے میں فائرمین سے ڈرائیور ہو گیا لیکن اماں کی زندگی کی گاڑی وہیں کی وہیں رہی۔ اماں ابا کتنے مزے سے غربت بھگت رہے ہیں اور میں ان سے سیکڑوں میل دور اپنے ساتھیوں میں "غلام بابو" کہہ کر پکارا جاتا ہوں، کالونی میں سب سے اچھا کھانا میرے یہاں پکتا ہے اور صرف میرے ہی گھر ٹیلی ویژن ہے۔ اس دن شکار پر آتے وقت میں نے اماں سے کہا تھا اماں میں عید کے دوسرے ہی دن واپس چلا جاؤں گا۔ ٹیلی ویژن خراب پڑا ہے منو اور آپ کی بہو بور ہو رہے

ہوں گے، مجھے وہاں جا کر ٹیلی ویژن ٹھیک کرانا ہے۔

اماں یہ سن کر کچھ نہیں بولی تھی۔ اس نے یہ بھی نہیں کہا کہ بیٹا غلام تم اب اللہ رکھے پچاس برس کے ہو رہے ہو تم نے اس طویل عرصے میں ایک دن بھی یہ نہیں پوچھا کہ اماں تم اور ابا میرے بغیر یہاں خود کو غیر محفوظ سمجھ کر تو زندگی نہیں گزارتے ہو اور یہ کہ اماں تمھارے پاندان میں اب بھی کھجور کی گٹھلیاں ہیں یا اب وہ بھی نہیں ہیں۔

اُف ..... وہ منظر ..... میں نے برسوں اسی سامنے والے کنارے کی طرف حامد کے اشارہ کرنے پر دیکھا تو نظر آیا کہ شیشم کے دو درختوں کے درمیان ایک ریلوے اسٹیشن کا کمرہ ہے اور کمرے کے برابر ریل کی پٹری پر میں بہت تیزی سے انجن میں ریل گاڑی چلاتا چلا جا رہا ہوں۔ دونوں طرف مٹی اڑ رہی ہے اور سامنے ریل کی پٹری پر اماں کھڑی ہے اور وہ چلا رہی ہے ..... غلام رک جاؤ، غلام رک جاؤ۔ میں تم سے کچھ نہیں مانگتی۔ تم ہم سے ملنے سال میں دو دفعہ بھی مت آیا کرو، میں کبھی تم سے کچھ نہیں کہوں گی لیکن اپنی گاڑی سے مجھے کچلو تو مت ..... لیکن ..... میں نہیں رکا۔ میری گاڑی کا انجن میری ضعیف ماں کے بدن کے پرخچے اڑاتا ہوا تیزی سے نکل گیا اور ماں کے خون میں لتھڑے گوشت کی بو کو میں نے سونگھ کر محسوس کیا اور پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک سرخ ڈھیر پٹریوں پر پڑا تھا جو آہستہ آہستہ معدوم ہو گیا۔ تبھی میں نے اپنی ہڈیوں میں ٹھنڈی ہوا کی رگڑ محسوس کی اور اس منظر سے واپس آیا تو سب ساتھ والے خاموش اور خوف زدہ کھڑے تھے اور حامد بے ہوش ہو چکا تھا لیکن اس منظر میں میرا کیا قصور تھا؟ میں نے تو بریک پر ہاتھ رکھا تھا لیکن اس وقت مجھے خیال آیا تھا کہ سامنے مجھے روکتی ہوئی یہ بوڑھی عورت وہی ہے جس نے اگر مجھے اپنی کوکھ سے پیدا نہ کیا ہوتا تو ساتویں کلاس میں میرے ساتھی کسی لڑکے کی رفو کی ہوئی پتلون کا مذاق اڑاتے۔ میں اس خیال کے دھارے میں اتنا آگے بڑھ گیا کہ جب ماں کے کٹے ہوئے بدن سے پھوٹتی ہوئی خون کی تیز مہک میری ناک میں آئی تب میں ہوش میں آیا تھا۔

میں نے دیکھا کہ غلام ماموں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا ہے اور چپ

سامنے پُل پر ٹرک اور ٹریکٹروں کا جلوس آرہا تھا۔ لوگ دیوانہ وار نعرے لگا رہے تھے اور ایک عجیب جذبے کے ساتھ آگے بڑھتے چلے آرہے تھے۔

دونوں کے ذہنوں نے کام کرنا بند کردیا۔ دونوں گاڑی میں بیٹھے رہے۔ جلوس برابر سے گزرتا رہا۔ گاڑی رکوانے والے وہیں کھڑے کھڑے نعروں کا جواب دیتے رہے سرفراز نے آیۃ الکرسی یاد کی۔ جلوس گزر گیا تو وہ لوگ بھی زور زور سے کچھ باتیں کرتے جلوس کے ساتھ بڑھ گئے۔

سرفراز سخت ذہنی دباؤ میں تھا اس لیے گاڑی فوراً اسٹارٹ نہیں کرسکا۔ دونوں بیٹھے ایک دوسرے کا ڈر محسوس کرتے رہے۔

سرفراز نے گاڑی اسٹارٹ کی تو انور بولا۔

"کھلے عام سڑک پر اِکا دُکا آدمیوں سے کچھ نہیں کہتے۔ اِکا دُکا آدمیوں سے نپٹنے کے لیے شہر شہر گاؤں گاؤں لوگوں کو تیار کیا گیا ہے۔ پچھلے جمعے کو جب احمد شہر کی پٹری سے باغ کی طرف مڑا تو اچانک کسی نے پیچھے سے....."

سرفراز کے بدن میں سر سے پاؤں تک سنسنی دوڑ گئی، وہ خالی ذہن کے ساتھ گاڑی چلاتا رہا۔ انور بتاتا رہا۔

"اگر پورا جلوس اِکا دُکا آدمیوں پر حملہ کرے تو بدنامی بھی تو بہت ہوگی۔ ویسے اپنی طرف سے بھی تیاریاں ٹھیک ٹھاک ہیں۔" اس نے یہ بات رازداری کے لہجے میں بتائی۔

جب وہ نہر کی پٹری پر مڑے تو سورج ڈوب رہا تھا۔ سرفراز کو اپنا بچپن یاد آگیا۔

تب اسے یہ خاموش نہر، سنسان پٹری، اور سائیں سائیں کرتے باغ کتنے بھیانک لگتے تھے۔

اس نے اچانک گاڑی کے بریک لگائے۔ ہیڈلائٹ کی روشنی میں ایک بڑا سا بندر ہتھیلیاں زمین پر ٹیکے ان کی طرف دیکھ کر خرخر کر رہا تھا۔ دونوں مسکرائے۔ بندر بھاگ کر درخت پر چڑھ گیا۔ اوپر کسی گدھ نے پہلو بدلا تو پھڑپھڑاہٹ کی آواز ہوئی۔ سرفراز نے سوچا پہلے اس پھڑپھڑاہٹ سے کتنا ڈر لگتا تھا۔

"تو یہ احمد دوکاندار والا معاملہ کب ہوا تھا؟"

"آج چار دن ہوگئے۔"

"ارے....." سرفراز کی ہتھیلیاں اسٹیرنگ وہیل پر نم ہوگئیں۔

"کیا ہوا؟" انور نے پوچھا۔ حالاں کہ اسے معلوم تھا کہ کیا ہوا۔

چاپ بیٹھے زمین تک رہے ہیں۔ تبھی حامد نے میری طرف کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھا جن کا مطلب میں نہیں سمجھ سکا۔ میں نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور غلام ماموں کو بہت قابل رحم محسوس کیا۔ خدا جانے انھوں نے کیا منظر دیکھا تھا لیکن مجھے یقین ہے انھوں نے جو کچھ بھی دیکھا ہوگا اس میں ان کا قصور نہیں ہوگا کیوں کہ میں نے بھی جو کچھ دیکھا تھا اس میں میری کیا خطا تھی! میرا دل بے اختیار چاہا کہ میں اس ڈوبتی ہوئی سرد شام کے اداس لمحوں میں سب کو بتا دوں کہ پرسوں سورج ڈوبنے کے بعد چاند نظر نہ آنے پر جب حامد نے نہر کے ادھر اشارہ کیا تھا تو میں نے دیکھا تھا کہ نہر کی پٹری پر میری شبانہ بالکل برہنہ پڑی ہے اور کچھ عجیب الخلقت آدمی اس کے پاس کھڑے ہیں جن کے سر اور پنجے بھیڑیوں جیسے ہیں اور وہ باری باری شبانہ کے جسم کی عصمت دری کر رہے ہیں میں وہیں قریب میں کھڑا ہوں اور میرے سارے اعضا پتھر کے ہیں صرف آنکھیں ہیں جن سے میں دیکھتا ہوں کہ شبانہ ہر بھیڑئے کو مطمئن کرنے کے بعد میری طرف آنکھیں کھول کر تکتی دیکھتی ہے اور پھر آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ وہ مجھ سے کچھ نہیں کہتی۔ مدد کے لئے بھی نہیں کہتی۔ اور پھر اگلا بھیڑیا آگے بڑھتا ہے اور تیز دانتوں اور پنجوں سے دل بھر کر شبانہ کو بھنبھوڑتا ہے اور دوسرے بھیڑئے کے لئے جگہ خالی کر دیتا ہے۔ اور پھر اگلا بھیڑیا آگے بڑھتا ہے اور پھر..... لیکن میں یہ منظر کیسے بتاؤں۔ یہاں اس نہر کی پٹری پر چھوٹے سے ٹیلے پر بیٹھا ہوا کوئی فرد تمھیں نہیں جانتا شبانہ! اور اب تو شاید میں تمھیں بھی بھولتا جا رہا ہوں۔ تم مجھ سے پوچھو گی کہ چھ سال میں ہی تم مجھے بھول گئے؟ تم نے تو زندگی بھر یاد رکھنے کا وعدہ کیا تھا شاہد علی!

تو میں تجھے جواب دوں گا شبانہ کہ چھ سال کی مدت یوں تو اتنی طویل نہیں ہوتی کہ تم سے بچھڑ کر تمھیں بھلایا جا سکے لیکن شاید تمھیں اس کا اندازہ نہ ہو کہ بے روزگاری کے دن برسوں سے زیادہ طویل ہوتے ہیں اور وہ بھی ایسی بے روزگاری جس کے ڈانڈے تمھاری جدائی سے ملتے ہوں۔ تمھیں شاید نہیں معلوم کہ ان طویل دنوں کے ساتھ کھردری تاریک راتیں بھی تو بندھی ہوئی ہیں جو اپنی سیاہی میں سب کچھ تاریک کر دیتی ہیں۔ ہاں

..... ہاں۔ تمھارا روشن چہرہ اور چمکتی ہوئی محبوب آنکھیں بھی تاریک ہو جاتی ہیں۔ تمھارے چمکتے ہوئے چہرے پر میری مادی کلفتوں نے بہت موٹے موٹے پردے ڈال دیئے ہیں..... اور دیکھو میری مجبوریوں اور محرومیوں نے اپنا انتقام لینے کے لئے میرے لاشعور کو کیسی اچھی پٹی پڑھائی ہے کہ میں تمھیں بھیڑیوں کے جنگل میں برہنہ اور اکیلا ڈال کر کھڑا ہوا تمھیں دیکھ رہا ہوں اور اپنے اعضا پتھر کے بنا لئے ہیں۔

حامد نے اٹھ کر میرے آنسو خشک کئے اور میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔

میں نے دل ہی دل میں کہا.....

کیا دیکھ رہا ہے پگلے۔ اب ان آنکھوں میں کیا دھرا ہے اب تو تو نے وہ بھی خشک کر دیئے ورنہ آنسو ہی دیکھ لیتا۔ لیکن میں حامد سے کچھ نہیں کہہ پایا۔ وہ مجھے اچانک اپنی عمر سے بہت بڑا نظر آیا جیسے بیٹھے بیٹھے ان لمحوں میں اس نے پاس بیٹھے ہم سب لوگوں کی عمروں کا تھوڑا تھوڑا حصہ مانگ لیا ہو۔ مجھے معلوم نہیں کیوں اس سے خوف محسوس ہوا۔ میں نے چاہا کہ اس کا ہاتھ چھوڑ دوں تاکہ وہ ان کمزور لمحوں میں میرے کانپتے ہوئے لمس سے کوئی نتیجہ نہ نکال لے۔ میں نے جب اس کا ہاتھ چھوڑنا چاہا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں اس کا ہاتھ نہیں پکڑے تھا بلکہ وہ میرا ہاتھ تھامے ہوئے تھا اور عزیز بھائی اور مجید بھیا کی طرف دیکھ رہا تھا۔

عزیز اور مجید نے سوچا کہ پرسوں نہر کی پٹری پر جب چاند نہیں نکلا تو ہم لوگ ڈر گئے تھے کہ اس سال معلوم نہیں کیا ہو..... پچھلے سال تو تیز اور گرم ہواؤں نے آم کی ساری فصل تباہ کر دی تھی اور اس سال سنا ہے وہاں لوگ لڑ رہے ہیں۔ ہندوستان سے وہاں کوئی چیز نہیں جا سکتی۔ آم تو پھر شوقیہ کھانے کی چیز ہے۔ لڑائی کے عالم میں بھلا ہمارے آم کون پوچھے گا اور کسی کو بھلا کیا خبر کہ آم کی فصل ہی ہمارے بچوں کو سال بھر روٹی دیتی ہے..... تو اس وقت حامد میاں نے اشارہ کر کے بتایا تھا کہ سامنے ان دو شیشموں کے بیچ ایک گھر سا بنا ہوا ہے۔

تو جب ہم نہ دیکھا تو نظر آیا کہ ڈوبے ہوئے سورج کی زرد روشنی میں وہاں ایک گھر بنا ہے جس کے دروازے پر ہم کھڑے ہیں اور اس گھر کے چاروں طرف آم کے باغات

ہیں اور ان آم کے باغوں میں چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے' دھڑا دھڑ درخت جل رہے ہیں' پکے ہوئے آم آپ ہی آپ پھوٹ رہے ہیں اور ان میں سے انگارے نکل رہے ہیں۔ اور درختوں سے جلے ہوئے مردہ پرندے ٹپک رہے ہیں اور جلتی ہوئی فاختائیں اور کبوتر پھڑک پھڑک کر دم توڑ رہے ہیں۔

ہم میں سب سے زیادہ سمجھ دار جمال میاں تھے تو ہم نے انھیں بتانے کے لئے جب ان کی طرف دیکھا تو وہ خود آنکھیں پھاڑے شیشموں کے بیچ کچھ دیکھ رہے تھے۔ اور تبھی ہم نے دیکھا تھا کہ حامد میاں شاہد میاں کی کمر پکڑے بے ہوش ہو چکے ہیں۔

تب جمال نے خاموش بیٹھے پانچوں افراد کو باری باری دیکھ کر پھر سوچنا شروع کیا ..... پرسوں دو شیشم کے درختوں کے بیچ اس کنارے پر نہر کی پٹری پر بنے گھر کی چھت پر اپنے آپ کو کھڑا دیکھ کر اس کنارے پر خود کو میں نے کتنا غیر محفوظ محسوس کیا تھا۔ اچانک غلام ماموں نے اس کنارے پر کچھ دیکھا اور کہا.....

"ارے دیکھو .... ہو سکتا ہے ان شیشموں کے درمیان دھوپ ڈھلتے وقت بڑے درختوں کا سایہ اس انداز سے پڑتا ہو کہ وہ جگہ ایک گھر کی طرح نظر آتی ہو۔ ابھی ابھی دھوپ ڈھلنے پر میں نے یہ محسوس کیا ہے۔ کیا تم لوگوں نے غور کیا؟....."

ہم سب نے ان کا یہ جملہ سنا اور بہتی ہوئی نہر کو دیکھا اور سامنے ان شیشموں کو دیکھا اور ڈھلتے ہوئے سورج کو دیکھا اور بہتی ہوئی نہر کی گمبھیر خاموشی کے اوپر سے واپس آتے ہوئے ہم نے شاید ایک ساتھ سوچا کہ سب دھوکہ ہے اور سب وہم ہے۔ لیکن یہ بہتی ہوئی نہر حقیقت ہے۔ اور ڈھلتا ہوا یہ سورج حقیقت ہے اور ہم بیٹھے ہوئے یہ سارے افراد حقیقت ہیں.....

جمال نے سوچا پرسوں حامد نے جیسے ہی اشارہ کیا تھا میں نے ادھر دیکھا تھا۔ میں اس نیم تاریک گھر کی چھت پر کھڑا تھا۔ سامنے دور دور تک میدان تھا جس میں بے شمار قافلے خاموشی سے چلے جا رہے تھے۔ قافلے والوں کے کندھوں پر جلتی ہوئی مسجدیں رکھی تھیں جن کے میناروں سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ جلتے ہوئے میناروں کو دیکھ کر قافلے والے

اپنی پیشانیوں کے زخموں سے بہتے ہوئے لہو کو اپنے ہاتھوں سے روکتے، ایک لمحے کو رکتے، سرخ ہتھیلیوں کو دیکھتے اور پھر قدم بڑھا دیتے تھے۔ بڑے میدان کو پار کر کے قافلے والے آہستہ آہستہ نیلے سمندروں میں اتر رہے تھے اور بے آواز سکون کے ساتھ ڈوب رہے تھے۔ اور جو قافلہ سمندر کی جانب سے رخ موڑتا اور کوئی اور سمت اختیار کرتا تو اس قافلے میں بھگدڑ مچ جاتی۔ اصیل گھوڑے بدن سے بدن ملائے اگلے سموں کو اوپر بلند کرتے دم کو سیدھا کرتے اور سانپ کی طرح پھنکار پھنکار کر ایک دوسرے پر حملہ کر دیتے اور ان کے سموں سے آگ کی چنگاریاں نکلتیں۔ بلبلاتے ہوئے اونٹ بھاگتے اور ٹھوکریں کھا کر سر کے بل گرتے اور تڑپ تڑپ کر جان دے دیتے۔ وجیہہ سپاہی چلّوں میں تیر جوڑتے اور کھڑے کھڑے بت بن جاتے۔ حسین اور طویل قامت عورتیں مشکیزوں میں پانی بھر بھر کے لاتیں اور لاشوں کے منہ میں پانی ڈال ڈال کر ان لاشوں کی آنکھیں کھول کھول کر دیکھتیں اور ان آنکھوں میں لپٹی ہوئی موت کا نوحہ پڑھتیں اور ان جسموں کو یاد کرتیں جن کی قربت انھیں میسر تھی۔ اور پھر طویل گریہ کے بعد وہ اپنی چوڑیاں توڑتیں اور کلائیوں میں سیاہ کلاوے باندھ کر سفید چادر ڈال لیتیں جنھیں دوسرے قافلے کے سپاہی کھینچ کھینچ کر وحشیانہ قہقہے لگاتے۔ اور پھر خاموش قافلوں کا سفر شروع ہوتا جو اپنے شانوں پر جلتی ہوئی سفید مسجدیں اٹھائے رواں تھے اور گہرے سمندروں میں غرق ہونے کے لئے آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے۔ اور جیسے ہی قافلہ سمندروں میں ڈوبنے سے انکار کرتا، اس قافلے کے گھوڑے سموں کو بلند کرتے، سانپ کی طرح پھنکارتے اور ایک دوسرے پر حملہ کر دیتے اور بلبلاتے ہوئے اونٹ ٹھوکریں کھا کر گرتے اور تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیتے.....

جمال نے سوچا شکار پر آنے سے پہلے میاں نے پوچھا تھا.....

"میاں! عہد وسطیٰ کی تاریخ پڑھانا کس قدر مشکل کام ہے....."

تو میاں نے آہستہ سے کہا تھا.....

"اس سے بھی زیادہ مشکل تاریخ ایک اور دور کی ہے....."

"وہ کون سا دور ہے میاں؟....."

تو میاں نے میری طرف اتنی مایوس نظروں سے دیکھا تھا کہ مجھے لگا جیسے میں اپنا پڑھا لکھا سب بھول چکا ہوں۔

پھر میاں نے اپنے شانوں پہ بکھری ہوئی سفید کاکلوں میں انگلیاں ڈال کر انھیں الجھا لیا تھا، گریبان میں ہاتھ ڈال کر اسے نیچے تک چاک کر دیا تھا اور آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر مجھ سے کہا تھا.....

"صبر کرو..... صبر کرو..... اور کم از کم ایمان کے ادنیٰ درجے سے کبھی گریز نہ کرو۔ اور شکر کرو کہ سارے دکھ سکھ تمھارے اپنے ہیں۔ تمھاری اپنی ملک۔ اب جاؤ۔ اور دیکھو..... گھبرایا مت کرو۔ لکھنؤ والے بھائی کو دیکھو دنیا جہان کی دردناک خبریں صبح و شام جمع کرتا ہے، انھیں پڑھتا ہے اور صبر کرتا ہے۔ اور مجھے وہاں سے لکھتا ہے کہ اسے اب شب خون کا خطرہ نہیں رہا، اس نے خیموں کو جلا کر صحرا روشن کر لیا ہے اور اس موج خون سے اپنا چہرہ گل نار کر لیا ہے جس سے کبھی دجلے کا پانی روشن ہوتا ہے کبھی گنگا کا ..... اس نے مجھے یہ بھی لکھا ہے کہ جمال کو بتا دیجئے کہ جب بھی کہنہ محرابوں سے دھواں اٹھتا محسوس ہو تو خوابوں کا پھریرا روشن کر لے۔ بس..... اب جاؤ تمھارے ساتھی شکار کے لئے تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔"

وہاں سے نکل کر شکار کے لئے میں نہر پر آ گیا جہاں وہ منظر دیکھا.....

جمال سوچ کی دلدل سے آہستہ آہستہ اوپر ابھرا تو پانچوں ساتھی نیچے سر ڈالے خاموش بیٹھے تھے۔ جمال کو محسوس ہوا کہ سرد موسم کے ڈھلتے ہوئے دن کی شام کو بہتی ہوئی نہر کے کنارے اس چھوٹے سے ٹیلے پر ہم سب لوگ صدیوں پرانے کھنڈر ہیں جو خود اپنے آپ کو اپنی داستان سنا رہے ہیں۔ ہر جگہ ایسے ہی کھنڈر بکھرے پڑے ہیں جہاں داستانیں سنائی جا رہی ہیں۔ پوری داستان یاد نہیں رہی ہے، جو حصہ یاد آجاتا ہے وہیں سے قصہ شروع ہو جاتا ہے۔ اصل سرا ہاتھ سے چھوٹ کر کہیں کھو گیا ہے۔

تبھی ایک کھنڈر نے اپنا سر سینے سے اٹھایا اور بولا.....

"میاں نے چلتے وقت مجھ سے کہا تھا کہ آج نہر پر ذرا زیادہ دیر نہ کرنا..... اب حامد سے پوچھ لیں کہ اس نے پرسوں شیشم کے درختوں کے بیچ کیا دیکھا تھا....."

غلام ماموں کی آواز سن کر جیسے ہم لوگ جاگ پڑے اور ہم سب کو ایسا محسوس ہوا جیسے ہم سب ایک ساتھ الگ ہوئے تھے اور برسوں کا سفر طے کر کے کوسوں کی مسافت کے بعد ابھی ابھی واپس آئے ہیں، مجھے لگا جیسے اس پورے عرصے میں ہم لوگ ایک دوسرے سے بالکل اجنبی ہو گئے تھے اور سارے لوگ ایک دوسرے سے الگ ہو کر علیحدہ علیحدہ آسیب زدہ اور خاموش جزیروں میں بیٹھے ہوئے اپنے سینے پر لکھی ہوئی وہ دھندلی تحریر پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے جس میں جزیرے سے باہر نکلنے کا راستہ لکھا تھا۔

دھوپ اب زرد ہو گئی تھی اور بہت دور کے کھیت دھند میں آہستہ آہستہ گم ہو رہے تھے۔ بڑی فاختہ خاموش ہو چکی تھی۔ نہر دھیمے دھیمے بہتی چلی جا رہی تھی اور ہمیشہ کی طرح شام ہونے پر اور زیادہ گہری محسوس ہونے لگی تھی۔ اور سردیوں کی اس خاموش اور اجنبی شام میں ہم سب لوگوں کے پاس بیٹھا ہوا وہ لڑکا ہم سب کو باری باری غور سے دیکھ رہا تھا۔

جس وقت اس نے اپنی زبان سے پہلا لفظ کہنا چاہا اس وقت میں نے ہی نہیں ہم سب نے محسوس کیا کہ وہ انجان لمحہ آ گیا جس کا ہم سب کو انتظار تھا۔ ہم سب جو اب اپنی واردات سے واقف تھے۔ ایک دوسرے سے خود کو منسلک بھی سمجھ رہے تھے اور جدا بھی۔ اس بے نام کیفیت میں معلوم نہیں کیوں ہم سب نے خود کو مجرم سا محسوس کیا۔

حامد نے تمام سہمے ہوئے چہرے کو ایک بار پھر غور سے دیکھا تو غلام ماموں نے کہا.....

"آج میاں نے صبح ہی صبح اسے گھر سے بلا کر اس پر دعا دم کی اور اس سے پوچھا کہ اس نے کیا دیکھا تھا' حامد نے جب اپنا دیکھا میاں کو سنایا تو وہ بہت روئے اور جب یہ ان کے رونے سے گھبرا کر خود بھی رونے لگا تو میاں نے اس کے آنسو پونچھ کر اس سے کہا تو ابھی بہت کم عمر ہے تو نے ابھی کھویا ہی کیا ہے کہ تجھے صبر کی تلقین کر سکوں۔ بس اللہ تجھے توفیق دے کہ تو اپنے بڑوں کا قرض ادا کر سکے اور ان کے دکھ برداشت کر سکے۔ اللہ تجھے

ہمت دے اور پر امید رکھے۔ پھر میاں نے حامد سے کہا کہ آج تو نہر پر سب کے ساتھ جائے گا۔ کوئی اپنا منظر نہیں بتائے گا میں غلام کو منع کر چکا ہوں۔ لیکن تجھے تو بتانا ہوگا۔ تجھے تو بتانا ہوگا میرے پوت....."

اسی وقت ہوا کسی درخت کی ٹہنیوں سے الجھ کر نکلی اور ہم لوگوں کے سروں پر ناچنے لگی اور ہم نے خود کو بہت کمزور محسوس کیا۔

تبھی حامد نے دھیمے دھیمے کہنا شروع کیا۔

اور جب وہ اپنا منظر بیان کر کے خاموش ہوا ہم سب کی پتھرائی ہوئی ساکت پتلیاں اس کا چہرہ تک رہی تھیں اور وہ بے رحم نظروں سے ہماری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

غلام ماموں پسینے سے تر ہو گئے تھے۔ ہم لوگوں کی بھیگی ہوئی پیشانیوں کو دیکھ کر انھوں نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھا اور بہت تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ پورا منظر بیان کر کے حامد نے میاں سے پوچھا تھا کہ یہ سب کس نے کیا ہے تو ..... تو میاں نے اسے بتا دیا کہ یہ کس کا کام ہے۔" یہ کہہ کر غلام ماموں نے اپنا سر نیچے ڈال لیا۔ ہم سب نے بھی خاموشی کے ساتھ اپنے سر جھکا لئے کہ اور چارہ بھی کیا تھا۔

"شام ہو رہی ہے۔ گھر واپس چلو۔" غلام ماموں کی آواز بہت شکستہ تھی۔ اور واپسی میں ابھی قصبہ دور تھا کہ سورج ڈوبنے لگا۔ سڑک کے دونوں طرف کے درختوں نے راستے کو مزید دھندلا کر دیا تھا۔ ہم سب ایک دوسرے کے قریب قریب چل رہے تھے کہ اچانک کوئی سیار زور سے رویا اور ہمیں آسمان کے نچلے کنارے پر شروع تاریخوں کا مہین اجنبی چاند نظر آیا اور اسی وقت ہم نے دیکھا کہ خلاف معمول آج حامد نے غلام ماموں سے بندوق لے کر اپنے ہاتھ میں لے لی ہے معاً ہمیں خیال آیا کہ حامد نے تو ابھی بندوق چلانا سیکھا ہی نہیں ہے۔ پھر بھی نہ جانے کیوں ہم سب کو ایسا اطمینان محسوس ہوا جیسے دل بھر کے رونے کے بعد ابھی خاموش ہوئے ہوں۔ ہم سب نے چور نگاہوں سے حامد کی طرف دیکھا جس نے تھوڑی دیر پہلے نہر کی پٹری پر اپنا منظر بیان کرتے وقت کہا تھا۔

"پرسوں جب چاند نہیں دکھا اور جمال بھائی نے کہا کہ چاند تیسا تھا نہ بھی نظر آئے

تو کیا فرق پڑے گا تو بس یہی سن کر مجھے امی کی بات یاد آئی کہ عید تو بچوں کے لئے ہوتی ہے اور چاند نکلتے ہی شروع ہو جاتی ہے تو میں نے سوچا کہ چاند ہی نہیں نکلا تو عید کیسے شروع ہو پائے گی۔ بس اسی وقت سامنے والے دو درختوں کے بیچ مجھے ایک گھر سا بنا ہوا دکھائی دیا اور اس گھر سے میں نے اپنے آپ کو نکلتے دیکھا۔ میری دونوں آنکھیں پھوٹی ہوئی تھیں اور کان بند تھے اور زبان کٹی ہوئی تھی۔ میں ٹھوکریں کھاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ اتنے میں گھر کے دروازے سے ایک اور لڑکا باہر نکلا۔ یہ بھی... یہ بھی میں ہی تھا۔ میری دونوں آنکھیں پھوٹی ہوئی تھیں، کان بند تھے اور زبان کٹی ہوئی تھی۔ میں پھر ٹھوکریں کھاتا ہوا آگے بڑھا کہ اور لڑکا باہر نکلا۔ اس بار معلوم ہے کون تھا؟ اس بار بھی میں ہی تھا اور میری دونوں آنکھیں پھوٹی ہوئی تھیں اور کان بند تھے اور زبان کٹی ہوئی تھی۔"

"اس گھر سے مسلسل میں ہی باہر نکل رہا تھا اور ٹھوکریں کھاتا ٹٹولتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔"

"اسی وقت میں نے آپ سب کو جلدی سے دکھایا تھا کہ وہ سامنے کیا ہے، شیشم کے نیچے۔ آپ سب لوگ دیکھنے میں لگ گئے اور کسی نے یہ بھی نہیں بتایا کہ سامنے اس گھر میں سے جو لڑکے باہر آ رہے ہیں ان کی صورت میری جیسی کیوں ہے اور میری آنکھیں کس نے پھوڑی ہیں، میرے کان کس نے بند کئے ہیں، میری زبان کس نے کاٹ ڈالی ہے۔ لیکن اب... میاں مجھے بتا چکے ہیں۔"

چلتے میں حامد نے تیز نظروں سے ہم سب کو باری باری دیکھا جیسے کچھ پوچھنا چاہتا ہو لیکن ہم میں سے کوئی بھی اس حالت میں نہیں تھا کہ اسے جواب دے سکے۔

تو جب قریب کے درختوں کی پرچھائیوں نے دور کے درختوں کی پرچھائیوں کو کاٹا اور اس عالم میں ہم لوگوں کے لمبے لمبے سائے، دھند میں ڈوبی نیم تاریک بستی میں داخل ہوئے تو ہم مجبور لوگوں نے بہت بے بسی کے ساتھ بے حد واضح طریقے سے محسوس کیا کہ اب ہم سب کے سب اس اناڑی بندوق والے کی رہنمائی میں پیچھے پیچھے چل رہے ہیں جس کی دونوں آنکھیں پھوٹی ہوئی ہیں۔

ببُول کے کانٹے

ببول کے کانٹے

(قاضی عبدالستار کے لیئے)

رات بوڑھی ہو چکی تھی جب میں ان گلیوں میں داخل ہوا جہاں میں نے اپنے بچپن کو جوان کیا تھا۔ بارہ سال... اف بارہ سال ہو گئے مجھے یہاں سے گئے ہوئے۔ سڑک پر بجلی کے کھمبے ساکت کھڑے تھے۔ ان کے ٹمٹماتے زرد رو قمقموں سے بس اتنی ہی روشنی پھوٹ رہی تھی کہ آدمی اندھیرے میں کھمبوں سے ٹکرا نہ جائے۔ رکشہ قصباتی سڑک پر دھیرے دھیرے رینگ رہا تھا۔ صبح ہونے میں ابھی دیر تھی۔ آسمان آہستہ آہستہ ستاروں سے بے نیاز ہو رہا تھا۔ آسمان کی جڑوں سے اگی ہوئی صبح کاذب کی دھندلی دھندلی سفیدی سڑک کے کھمبوں کی روشنی سے مل کر بھی اتنا اجالا نہیں جنا سکی تھی کہ میں دوکانوں اور مکانوں میں اس تبدیلی کا اندازہ کر سکوں جس کا نقشہ اپنے ذہن پر بنائے ہوئے میں آج بارہ سال بعد لندن سے واپس آرہا ہوں۔ دوکانیں پختہ اور کشادہ ہو چکی ہونگی، مکانات خوبصورت اور دلکش ہو گئے ہوں گے۔ ایک دن کسی ہندوستانی اخبار میں پڑھا تھا کہ قصبہ میں ایک بینک کی شاخ بھی قائم ہو گئی ہے۔ معلوم نہیں اسکی عمارت کس محلے میں ہے اس اندھیرے میں تو کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ صبح ناشتہ کرنے کے بعد قصبہ بھر میں گھوموں گا۔

بڑے چوراہے پر رکشہ آچکا ہے۔

"کدھر چلنا ہے بابو جی؟" رکشہ والا مجھ سے پوچھ رہا ہے۔

"میں نے اسٹیشن پر تمہیں بتایا تھا کہ بڑے چوک جانا ہے۔ کیا بھول گئے؟"

"نہیں بابو جی مجھے ناں معلوم بڑا چوک کدھر ہے..."

"تو تم نے مجھے وہاں کیوں نہیں بتایا تھا..."

"آپ کسی دوسرے رکشے میں جو بیٹھ جاتے..."

رکشہ والے اب بھی ویسے ہی غریب ہیں جیسے بارہ سال پہلے تھے لیکن بارہ سال پہلے

نہیں کچھ نہیں۔ یعنی ابھی بالکل تازہ واقعہ ہے۔ کچھ پتہ لگا؟"

"پتہ کیا لگتا۔ الٹے تھانے دار نے دفن کے بعد ہی سب کو ڈانٹا کہ جب ایسے حالات چل رہے ہیں تو سورج مندے گھر سے باہر نکلنے ہی کیوں دیا۔ اندھیرے میں حملہ کرنے والوں کو مار کر بھاگنے میں سہولت رہتی ہے۔"

"گاڑی یہیں روک کر پیک کر کے لگادو۔ آگے راستہ نہیں ہے۔" انوار بولا۔

پٹری سے اترتے ہی باغ سامنے آگیا۔

سرفراز نے گاڑی پیک کر کے لگادی اور باغ کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

کہرے میں لپٹا باغ بہت دن بعد دیکھا تھا۔ آج اسے باغ سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوا لیکن ایک عجیب سا سناٹا دونوں کے اندر خاموشی سے اتر آیا تھا جو باتیں کرنے کے باوجود ٹوٹ نہیں رہا تھا۔

دونوں جب جنات بابا والے پرانے درخت کے پاس سے گزر رہے تھے تو سرفراز نے اچانک رک کر انوار کا ہاتھ اتنے زور سے دبایا کہ دُکھن ہڈیوں تک پہنچ گئی۔

انوار نے سرفراز کی طرف دیکھا۔ سرفراز نے آنکھ کے اشارے سے باغ کی بڑی بینڈھ کی طرف اشارہ کیا۔ انوار کو کچھ نظر نہیں آیا۔ اندھیرے میں وہ اس جگہ کا تعین بھی نہیں کر پایا جہاں سرفراز نے اشارہ کیا تھا۔

سرفراز نے اس بار اور بھی زیادہ زور سے ہاتھ دبایا اور اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے پکڑے واپس مڑا اور کھینچنے والے انداز میں دوڑتا، گرتا، سنبھلتا باغ سے باہر نکلا۔ گاڑی میں انوار کو دھکیل کر گاڑی اسٹارٹ کی اور فل اسپیڈ پر نہر کی پٹری پر چڑھا کر پل پار کر کے کچی سڑک پر آگیا۔ سرفراز شدید کھنچاؤ کے عالم میں گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کا چہرہ ہوئے ہوئے کانپ رہا تھا اور پورا بدن پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔

"اب دور نکل آئے ہیں۔ بتاؤ تو سہی کیا بات تھی؟" سرفراز نے گاڑی روک دی۔

"باغ کی بینڈھ پر درختوں کے درمیان ایک آدمی جھکا کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار تھا جسے وہ زمین پر ٹکائے ہوئے تھا۔"

بڑے چوک کا پتہ ضرور معلوم ہوتا تھا۔ بڑا چوک، حبیب میاں کا بڑا چوک، جسکے پھاٹک پر گردو نواح کے تمام دیہاتوں کی لیکھیں آکر رکتی تھیں۔ وہ بڑا چوک جس میں داخل ہوتے وقت لوگ اپنی عزت باہر رکھ جاتے ہیں اور اس رکشہ والے کو بڑا چوک کا پتہ نہیں معلوم مجھے عجیب سی ذلت اور شرمندگی محسوس ہوئی۔

"بائیں موڑلو....." میں رکشہ والے سے کہتا ہوں۔

اب رکشہ بڑے چوک کے سامنے کھڑا ہے۔

میری انگلیاں جیب میں نوٹ ٹٹول رہی ہیں اور نگاہیں اس جگہ کو تلاش کر رہی ہیں جہاں بڑے چوک کا پھاٹک ہوا کرتا تھا۔ منشی چچا سے میں نے اپنے بچپن میں سنا تھا کہ ہمارے گھر کا پھاٹک اتنا اونچا ہے کہ ہودے سمیت ہاتھی نکل سکتا ہے۔

رات نے آخری ہچکی لی اور سویرے کی دھندلی پھیکی پھیکی روشنی میں میں نے بار بار دیکھا اور پھر سوچا کہ اگر میری آنکھیں مجھے فریب نہیں دے رہی ہیں اور یہی میرا بڑا چوک ہے تو آج اس پھاٹک میں سے ایک نہیں، تلے اوپر دس ہاتھی ہودے سمیت نکل سکتے ہیں۔ اے خدا یہ بارہ سال کا عرصہ اتنے بڑے پھاٹک کو کتنی آسانی سے نگل گیا۔ آج تو یہاں صرف وہ دیواریں شکستگی کا لبادہ اوڑھے کھڑی ہیں جن میں وہ پھاٹک جکڑا ہوا کرتا تھا۔

"بابو جی دیر ہو رہی ہے....." رکشہ والا مجھے گھور رہا ہے۔

میں نے اسے دو روپیہ کا نوٹ پکڑا دیا۔ نوٹ جیب میں رکھ کر سیٹی بجاتا ہوا وہ چلا گیا۔

میں نے اٹیچی اٹھائی اور دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

منشی چچا تم ڈیوڑھی میں سو رہے ہو گے، میں ابھی تمہیں جگاؤں گا اور تمہارے منہ پر ہاتھ رکھونگا کہ معلوم نہیں بارہ برس بعد مجھے اچانک دیکھ کر تم کتنی دیر تک دعاؤں کا وظیفہ پڑھو کیونکہ مجھے یہ پوچھنے کی جلدی ہے کہ شیشم کا وہ مضبوط پھاٹک کہاں چلا گیا جس میں سے ہودے سمیت ہاتھی نکل جاتے تھے اور تم سے یہ بھی پوچھنا ہے کہ رکشہ والے نے روپیہ لیکر مجھے سلام کیوں نہیں کیا کہ بارہ برس پہلے تو یہ سامان اٹھا کر گھر کے

دروازے تک لاتے تھے۔ اور منشی چچا یہ بھی بتا دو کہ بارہ برس میں اتنا بڑا کون سا انقلاب آگیا کہ رکشہ والے بڑے چوک کا پتہ بھول گئے۔

میں ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ ڈیوڑھی خاموش تھی اور تاریک بھی۔ میں سنبھل سنبھل کر قدم بڑھا رہا ہوں کہ منشی چچا کے پلنگ سے نہ ٹکرا جاؤں اور جب اسی طرح اندرونی دروازے تک پہنچ گیا اور منشی چچا کا پلنگ نہیں ملا تو میرے ذہن میں لاتعداد کچوے رینگ گئے۔ کیا منشی چچا تم مر گئے؟ یا تم بھی پھانک کی طرح بڑے چوک سے نکل کر کہیں چلے گئے ہو؟

"کون ہے دروازے میں، کون ہے بھئی؟" اندر سے وہ آواز آئی جسے سنکر منشی چچا سوتے میں خواب دیکھنا بھول جاتے تھے۔

میں گھر میں داخل ہو رہا ہوں۔ سب کچھ ویسا ہی۔ ویسی ہی اونچی اونچی دیواریں، وہی لمبا چوڑا آنگن۔ اتنے دنوں میں کچھ بھی نہیں بدلا۔ لیکن سامنے کھڑا ہوا یہ شخص بہت بدل گیا ہے۔ اس شخص کی خوبصورت کھچڑی داڑھی بالکل براق ہو گئی ہے۔ میں سامنے کھڑے اس شخص سے، حبیب احمد میاں سے، اپنے باپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپکا فربہ جسم اور صاف ستھرے کپڑے کہاں چلے گئے۔ یہ آپ ہڈیوں کا ڈھانچہ بنے میلے کچیلے کپڑے بدن پر اٹھائے کیوں کھڑے ہیں اور یہ کہ منشی چچا ڈیوڑھی میں کیوں نہیں ہیں؟ اور نہ جانے کیا کیا لیکن میں نے محسوس کیا کہ میری زبان پتھر کی ہو گئی ہے۔

میرے باپ کے ہاتھ جن کی انگلیوں کے ایک اشارے میں کھیت دوڑتے ہوئے ایک کسان سے دوسرے کسان کے پاس چلے جاتے تھے، وہ ہاتھ جنکی ایک جنبش سے ایک کسان روتا تھا دوسرا ہنستا تھا، آج وہی شفیق ہاتھ میرے کاندھوں پہ کانپ رہے ہیں۔ اور وہ بارعب آنکھیں جنھیں دیکھکر میرے اوسان خطا ہو جاتے تھے، آج آنسوؤں سے نم ہیں۔

"تم نے ہمیں سلام نہیں کیا آج بارہ برس بعد واپس آرہے ہو اختر میاں۔" اور میں ان کے کاندھوں سے لگ کر ساکت ہو گیا جیسے میرے بدن میں حرکت نام کی چیز ہی نہ ہو۔

اور جب صبح ہوئی تو میں نے اپنے گھر میں اتنی حیرت انگیز تبدیلیاں دیکھیں اور مجھے

اتنا تعجب ہوا کہ پہلی بار لندن میں قدم رکھ کر، لندن جیسے عظیم الشان شہر کو دیکھ کر بھی نہیں ہوا تھا۔ آج پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ میری ماں۔ کے غرارے میں پیوند بھی لگ سکتا ہے۔

صدر دالان میں جہازی پلنگ پر دوسری طرف منہ کئے، لیٹے ہوئے ابا نے بتایا کہ منشی چچا کو ملازمت سے اسلئے نکال دیا کہ وہ بہت بد مزاج اور بد زبان ہو گئے تھے۔ اور مجھے اپنے گھر کا سب سے وفادار ملازم منشی چچا یاد آگیا۔ جب وہ باتیں کرتا تھا تو یتیم بچوں کو اپنے باپ یاد آجاتے تھے اور بد مزاجی اور بد زبانی سے وہ اتنا ہی ناواقف تھا جتنا لندن میں رہ کر میں اپنے گھر کے حالات سے بے خبر ہو گیا تھا۔ ابا بتا رہے ہیں کہ پھاٹک کے دروازوں کو دیمک چاٹ گئی تھی۔ نکال کر ایندھن کے کام میں لے آئے گئے۔ اور میرے ذہن میں دیمکیں رینگنے لگیں، مجھے لندن کے قیام کے آخری دن یاد آگئے۔ واپسی کے کرایہ کے لئے کچھ روپیہ کم پڑ رہے تھے۔ ابا کو مطلع کیا تھا اور چند روز بعد ہزار روپیہ کا بنک ڈرافٹ آگیا تھا۔ ابا کہہ رہے ہیں کہ میں نے بجلی اسلئے کنوادی کہ تیز روشنی میری آنکھوں کو نقصان پہنچاتی تھی۔ میرا دل چاہا کہ کہوں کہ ابا آپ تو نیلے اور ہرے بلبوں کا مصرف بھی جانتے تھے جن سے صرف دھیمی دھیمی روشنی پھوٹتی ہے جو آنکھوں کو صرف سکون اور ٹھنڈک بخشتی ہے۔ لیکن میں چپ ہوں مجھے کل کی شام یاد آرہی ہے جب میں ٹرین میں بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ میرے گھر میں داخل ہوتے ہی تمام بلب روشن کر دیئے جائیں گے تاکہ اماں مجھے غور سے دیکھ سکیں کہ پردیس نے میرے بدن کا کتنا گوشت کھالیا اور فیشن نے میرے سر پر کتنے بالوں کا اضافہ کیا۔ اب تو صرف یہ محسوس ہو رہا ہے جیسے ایک خواب سا دیکھا تھا۔

میں نے اٹیچی سے شال نکال کر بہن کے سر پر ڈالی تو پہلے وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر ہمک کر مسکرائی اور پھر بوڑھوں کی طرح خاموش ہو کر سنجیدہ ہو گئی۔

میرا دل چاہا کہ ابا مجھے سب کچھ صاف صاف بتادیں کہ اب وہ حبیب احمد میاں سے صرف حبیب احمد رہ گئے ہیں۔ وہ مجھے یہ بھی بتادیں کہ زمیں داری ختم ہو جانے کے بعد وہ

تمام رونقیں رخصت ہو گئیں جنکی گود میں ان کے اکلوتے لڑکے نے پاؤں پھیلائے تھے۔

"تم دلی میں کیوں رک گئے تھے؟" ابا پوچھ رہے ہیں۔

"ملازمت کے معاملات طے ہو رہے تھے۔ مجھے ملازمت مل گئی ہے۔ پندرہ سو روپیہ تنخواہ ہوگی۔"

میں ان کی دھندلی دھندلی آنکھوں میں چمک تلاش کر رہا ہوں جو اولاد کی ملازمت کی خبر سن کر باپ کی آنکھوں میں سج اٹھتی ہے۔

"خدا تمہیں ملازمت مبارک کرے۔"

بس ابا اتنی ہی مسرت۔ جائیے بھاگ کر اماں کو بتائیے کہ ان کے بیٹے کو پندرہ سو روپیہ کی ملازمت مل گئی ہے، پھر سنہرے دنوں کے خواب میں ڈوب جائیے۔ صرف رسمی سی مبارکباد دیکر خاموش نہ ہوں۔ میں کہنا چاہتا ہوں لیکن زبان پر اعتبار ہو تو کہوں۔

"تو تمہارا مستقل قیام دلی میں ہی رہے گا؟"

"جی ہاں وہیں پوسٹنگ ہوئی ہے۔"

"خدا کا شکر ہے۔"

ابا میں سمجھ رہا ہوں کہ آپ میرے دلی کے قیام سے بہت خوش ہیں تاکہ میں یہاں کی زندگی کو یکسر بھول جاؤں۔ میں سب سمجھ رہا ہوں ابا سب کچھ۔

دوسرے دن ابا نے بتایا۔ "تجھ سے لالتا پرشاد ملنے آیا تھا۔ تمہارے آنے کے متعلق میں نے بتایا۔ بیٹھے تمہارا انتظار کر رہے ہیں جاؤ مل آؤ۔"

دیوان خانے میں ٹھاکر چاچا مجھے بیٹھے گھور رہے ہیں شاید یہ اندازہ کر رہے ہیں کہ کل سے لیکر آج تک میں کتنا ٹوٹ گیا ہوں، کتنا لٹ گیا ہوں۔ ٹھاکر چاچا میں ان سے مخاطب ہو رہا ہوں۔ "یہ---- یہ سب کیسے ہو گیا؟"

"یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا۔ کیا تمہیں لندن میں اطلاع نہیں ملی کہ زمیں داری ختم ہو گئی؟"

"ہاں چاچا معلوم ہوا تھا۔ اخباروں میں پڑھا تھا لیکن ابا کے خطوط میں اسکا کوئی ذکر

ہی نہیں ہوتا تھا۔ میں سمجھتا تھا سب کام ویسا ہی چل رہا ہے۔"

"تازہ تازہ غم ہے اسلئے پریشان ہو رہے ہو۔ ہم لوگ تو رو دھو کر صبر کر چکے۔ تم بھی دل چھوٹا نہ کرو۔ اور سنا ہے تمہیں تو آتے ہی نوکری مل گئی، تمہیں کیا فکر ہے۔"

"فکر کی بات نہیں چاچا۔ ماں، باپ اور بہن اب بھی اسی شان سے زندگی گزاریں گے لیکن وہ جو ایک چیز ہوتی ہے....."

"لیکن ویکن چھوڑو۔ میں بھی جانتا ہوں کہ تمہیں غم کس چیز کا ہے۔ میں بھی تو وہی دکھ لئے بیٹھا ہوں۔ کھانے پینے بھر کا تو بھگوان نے سبھی کو دے رکھا ہے۔ اب تمہارا کام یہ ہے کہ حبیب میاں کو سہارا دو اور سب کچھ بھول جاؤ۔"

ٹھاکر چاچا چلے گئے۔

ان سے گفتگو کرنے کے بعد مجھے کچھ ڈھارس ملی۔ زمیں داری ختم ہونا تھی سو ختم ہو گئی۔ ہاتھ تو سلامت ہیں اور زندگی بہر حال کاٹ کر نہیں جی کر گزارنی ہے۔ ایک دو روز کے بعد دلی چلا جاؤں گا اور پھر سب کو وہیں بلالوں گا۔ گھر کے اندر آیا تو لگا جیسے ابا کی سفید داڑھی کی جگہ وہ خوبصورت سیاہ داڑھی آ گئی ہے۔ اماں کا غرارہ بہت قیمتی محسوس ہوا۔ بہن کی آنکھوں میں بچپن کی معصوم مسرت تیرتی ہوئی نظر آئی۔

سب فراڈ تھی یہ زمیں داری۔ اصل زندگی تو اب شروع ہوئی ہے۔ اپنے ہاتھوں کی کمائی کی زندگی۔ بلاوجہ گھبرا گیا تھا۔ کیا فرق پڑتا ہے اتنی لمبی چوڑی زندگی میں اگر ایک معمولی سا واقعہ پیش آ گیا تو۔ زندگی اب بھی ویسی ہی بھاگ دوڑ رہی ہے۔ زمیں داری ہوتی تو اسکے بھی کچھ مسائل ہوتے۔ مسائل تو ہر جگہ ہوتے ہیں یہ سب کچھ سوچا تو کچھ اطمینان سا محسوس ہوا۔ فضا میں ہر طرف سفید رنگ کے کبوتر اڑتے نظر آئے۔

شام ہو گئی ہے اور میں کھیل کے میدان کی طرف جا رہا ہوں۔ فٹ بال ہو رہی ہے اور لڑکے چاروں طرف بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں۔ بائیس کھلاڑی اور ایک گیند، کس کس کو ملے؟ یہ میں بارہ سال پہلے بھی سوچتا تھا جب یہ کھیل کا میدان میرے قدموں کے نیچے بھاگتا تھا۔ جب ہم عمر لڑکے کھیل ہی کھیل میں ایک دوسرے سے ناراض ہو جاتے

تھے تو ایک دوسرے کو دھکیل دھکیل کر ببول کے ان درختوں کے پاس لے آتے تھے جو میدان کے کنارے کنارے ایسے کھڑے ہیں جیسے فٹ بال کی ٹیم میدان میں اترنے کے انتظار میں کھڑی ہو۔ اور پھر لڑکے ایک دوسرے کو ببول کے درختوں میں دھکا دے دیتے تھے اور لڑکوں کے بدن ببول کے کانٹوں سے لہولہان ہو جاتے تھے اور پھر کیمس ٹیچر ماسٹر سوبھا رام سب لڑکوں کو ایک لائن میں کھڑا کر دیتے تھے اور بید نکال کر ایک طرف سے پیٹنا شروع کر دیتے۔ معلوم نہیں مجھے بچ میں کیوں چھوڑ جاتے تھے۔ بس میں تو یہی دیکھتا کہ میرے بائیں طرف کے لڑکے کو پیٹتے پیٹتے ایک دم زور زور گالیاں بکتے ہوئے میرے دائیں طرف کے لڑکے کے بدن کو دھننا شروع کر دیتے تھے اور ان کی گالیوں کے شور میں شاید لڑکے بھول جاتے کہ وہ مجھے پیٹنا بھول گئے ہیں۔

لیکن تھوڑے ہی دن بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ مجھے کیوں نہیں پیٹتے ہیں۔ ایک دن شفیق جب مار کھا کر رو رہا تھا تو اس نے کہا تھا۔

"یار ہم بھی اگر تمہاری طرح زمیں دار کے لڑکے ہوتے تو مار سے بچ جایا کرتے۔"

اور تبھی مجھے احساس ہوا تھا کہ کوئی مجھے دھکیل کر ببول کے کانٹوں سے بھی زخمی نہیں کرتا۔ میں اس سے پہلے تک یہی سمجھتا تھا کہ میں اپنی طاقت اور بہادری سے بچ جاتا ہوں۔

کسی اناڑی لڑکے کی ٹھوکر سے نکلی ہوئی گیند میدان سے باہر آ کر میری ٹانگوں سے ٹکرائی اور میں بارہ برس پہلے کے کھیل میدان سے آج کے کھیل کے میدان میں واپس آ گیا۔

میں نے گیند روک لی ہے۔ تلووں میں کھجلی مچ رہی ہے۔ ایک زوردار کک لگانے کو دل چاہ رہا ہے۔

ماسٹر سوبھا رام میرے سامنے کھڑے ہیں۔ وہی ورزشی جسم اور ویسی ہی کڑکتی ہوئی سیاہ مونچھیں جو تھوڑی دیر بعد غروب ہونے والے سورج کی زرد روشنی میں کچھ زیادہ چمک رہی تھیں۔

"یہ گیند ادھر دے دیجئے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ بچے کھیل رہے ہیں؟"

میدان کے کنارے کنارے کھڑے ہوئے ببول کے درخت اپنے نکیلے کانٹوں سمیت جیسے بھرا مارے میری طرف چلے آرہے ہوں۔

کیا ماسٹر سوبھارام مجھے بھول گئے؟ میں سوچ رہا ہوں۔ نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔

"میں اختر ہوں ماسٹر صاحب اختر میاں۔ کیا آپ مجھے بھول گئے؟"

میں انہیں بارہ سال پرانے ان کے ایک شاگرد کے متعلق بتا رہا ہوں۔

"جی ہاں مجھے معلوم ہے۔ میں آپ کو بھولا نہیں۔ آپ کو بھلا کون بھول سکتا ہے۔ میں تو آپ کو صرف جب بھولتا تھا جب لڑکوں کو ایک لائن میں کھڑا کر کے سزا دیتا تھا۔"

یہ ماسٹر سوبھارام بول رہے ہیں۔ کتنی زہریلی مسکراہٹ ہے اس وقت ان کے چہرے پر۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں چمکتے ہوئے ماسٹر سوبھارام کے ہونٹوں نے کئی بار اپنی کمانیں کھینچیں اور کئی دفعہ زہر میں بجھے تیروں کی طرح ان کی مسکراہٹ میرے بدن میں جگہ جگہ گڑ گئی۔

ببول کے درخت نکیلے اور چمکیلے کانٹوں سمیت میری طرف بڑھ رہے ہیں مجھے دبوچنے کے لئے۔

وہ سارا سکون وہ ساری خوشیاں جو تھوڑی دیر پہلے مجھے نصیب تھیں، اس ایک مسکراہٹ نے ان سب کو جلا کر راکھ کر دیا۔

مجھے محسوس ہوا کہ میں آہستہ آہستہ پست ہو رہا ہوں۔

اور مجھے سب کچھ یاد آگیا۔ میں میدان میں کھڑا ٹینم بنا رہا ہوں۔ میں فاؤل پہ فاؤل کرتا جا رہا ہوں اور ماسٹر سوبھارام جیسے سیٹی بجانا بھول گئے ہوں۔ لڑکے لائن میں کھڑے پٹ رہے ہیں اور ماسٹر سوبھارام کا ڈنڈا میرے بائیں طرف کے لڑکے سے دائیں طرف کے لڑکے پر آگیا ہے۔

ماسٹر سوبھارام! کیا آج ان تمام باتوں کا گن گن کر بدلہ لیا جا رہا ہے اور بدلہ بھی مجھ سے! میں تو آپکا شاگرد ہوں مجھ سے کیسا بدلہ؟ مجھ سے کیسا انتقام؟

ماسٹر سوبھارام مجھے خاموش دیکھ کر لڑکوں کو سمجھانے لگے ہیں۔

"اس کھیل میں ایک دوسرے سے ذاتی پرخاش نہیں ہونی چاہیئے۔ ایک ٹیم دوسری ٹیم سے لڑتی ہے۔ کسی کی ذاتی لڑائی نہیں ہوتی۔"

مجھے محسوس ہوا جیسے ماسٹر سوبھارام لڑکوں کو کھیل کا طریقہ بتانے کی آڑ میں اپنے رویہ کی صفائی پیش کر رہے ہوں۔

"ماسٹر صاحب۔" میں ان سے مخاطب ہو رہا ہوں۔

"جی فرمائیے۔" اف کتنا طنز ہے ان کی آواز میں۔

"اگر آپ اجازت دیں تو میں گیند میں ایک کک لگادوں۔ برسوں بعد فٹ بال ہوتے دیکھی ہے۔ دل چاہ رہا ہے۔" میں ان سے اپنے بیتے دنوں کی بھیک مانگ رہا ہوں۔

"جی ہاں جی ہاں شوق سے۔ آپ کو بھلا کون روک سکتا ہے اور اگر منع بھی کر دوں تو آپ دس گیندیں خرید کر دس ٹھوکریں لگا سکتے ہیں۔ آخر کو آپ زمیں دار تھے ناں یہاں کے۔ کیوں اختر میاں، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔"

میں فٹ بال میں کک لگائے بغیر واپس مڑ گیا ہوں۔

"زمیں دار تھے آپ یہاں کے۔ ہنہ زمیں دار۔" لڑکوں کے قہقہوں کو چیرتی ہوئی ماسٹر سوبھارام کی آواز نے پیچھے سے میرے کانوں پر پتھر مارا۔

میں رک گیا ہوں۔ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں۔ سورج ڈوب چکا تھا اور شفق کی سرخ روشنی میں چمکتی ہوئی سیاہ مونچھوں پر ماسٹر سوبھارام ہاتھ پھیر رہے تھے۔ ببول کے درخت جن سے آج تک کوئی لڑکا مجھے زخمی نہیں کر سکا تھا، وہی ببول کے درخت شفق کی سرخی کے سائے میں آج اپنے تمام کانٹوں کی نوکیں مجھے چمکا چمکا کر دکھا رہے تھے۔

میں نے ماسٹر سوبھارام کے چہرے پر آنکھیں گاڑیں۔ ان کی انگلیوں کی حرکت ان کی مونچھوں پر مزید تیز ہو گئی اور زندگی میں پہلی بار آج میں نے ببول کے کانٹوں کی چبھن کو محسوس کیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے ان کی مونچھوں کے کڑ کڑاتے ہوئے سیاہ بال ببول کے کانٹوں کا روپ دھار کر میرے بدن، میرے چہرے اور میری آنکھوں میں بُری طرح گھس گئے ہوں۔

بُلبُلہ

بُلبُلہ

سورج کی کرنیں ماند پڑ رہی تھیں، اونچی اونچی دیواروں کے سائے طویل ہو چلے تھے۔ دھوپ دیواروں کی چھت پر کب کی چڑھ چکی تھی لیکن ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس آنگن میں سورج اپنی پوری گرمی کے ساتھ دہک رہا ہے۔

"اس کمینے کی یہ مجال، کہ میرے بچے پہ ہاتھ اٹھائے۔ بھول گیا وہ دن جب اس کا باپ میری ڈیوڑھی میں بیٹھا بیٹھا چلم پیا کرتا تھا۔ اور ابا حضور کو دیکھ کر زمین تک جھک جاتا تھا"۔

شیخ نجیب احمد اپنی بیوی کے پاس کھڑے ہوئے گرج رہے تھے جو لکڑی کے صندوق میں جگہ جگہ سے کسکے ہوئے کمخواب کے غرارے کو اتنی احتیاط سے رکھ رہی تھیں جیسے کوئی زمین دار زمینداری ختم ہو جانے کے بعد اپنی بچی کھچی زمین کے کاغذات سینت سینت کر رکھتا ہو۔

ان کی بیگم ویسی ہی بیٹھی پرانے کپڑوں کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھتی رہیں جیسے ان میں اپنے ماضی کی رنگینیاں تلاش کر رہی ہوں۔ وہ جانتی تھیں کہ جو اس زمانے میں چلم پیا کرتے تھے ان کے پاس اب دولت کا نشہ ہے اور ان زمینداروں کے پاس اب دھواں ہی دھواں بچا ہے۔

انھوں نے صرف اتنا ہی کہا "جانے دیجئے اب کہنے سننے سے کیا فائدہ۔"

"نہیں جب تک میں اسے کھری کھری نہ سناؤں چین نہیں آئے گا۔ ویسے اس کمبخت کی یہ مجال نہیں ہو سکتی کہ وہ میرے منہ آئے۔" ہوا یہ تھا کہ ان کے لڑکے سرفراز کی کسی بات پر دلاور علی کے لڑکے سے تو تو میں میں ہو گئی اور دلاور علی نے ان کے لڑکے کو چانٹا مار دیا اور وہ روتا ہوا گھر آیا۔ جب اس نے رو رو کر سارا حال بتایا تو شیخ صاحب کے تن بدن میں کھن کھجورے سے رینگنے لگے۔ وہ سوچنے لگے یہ وہی دلاور علی ہے جو اپنے باپ کے ساتھ ناک صاف کرتا ہوا ان کے گھر آتا تھا۔ جس کا باپ ان کے گھر ۵ روپیہ اور دو وقت کی جھوٹن

چکّر

پر صرف اتنی سی بات کا نوکر تھا جب ان کے باپ شیخ رسول احمد ڈیوڑھی سے باہر قدم نکالیں تو وہ زمین تک جھک کر انہیں سلام بجالائے۔ اور آج جب زمین داری ختم ہو چکی ہے، وقت بدل چکا ہے اور یہ دلاور علی میونسپلٹی کا چیرمین بن گیا ہے تو دولت کے نشے میں اپنی ہستی ہی بھول گیا۔

بڑے دالان میں آکر انھوں نے سرج کی سرمئی شیروانی نکالی جس کے کالر کی اوپری کناری سے بکرم جھانک رہا تھا۔ پھٹے ہوئے استر نے کئی بار ان کے ہاتھوں کو شیروانی کی آستینوں میں جانے سے روکا۔ بیوی کے مسکے ہوئے زرد جارجٹ کے دوپٹے سے انھوں نے شیروانی خوب جھاڑی پونچھی سفید کشمیری اون کا اسکارف نکالا۔ حالانکہ اتنی سردی نہیں تھی کہ اس کی ضرورت پڑے لیکن وہ جانتے تھے کہ اسکارف سے صرف جاڑا ہی نہیں رکتا، شیروانی کا پھٹا ہوا کالر بھی چھپ سکتا ہے۔

سلیم شاہی جوتوں میں پاؤں ڈالتے وقت انہیں لگا کہ آج وہ پھر زمیندار ہیں اور دلاور علی کا باپ کھڑا ہوا ان سے گالیاں سن رہا ہے۔

سرفراز سے رکشا لانے کو کہا اور لکڑی کے کرم خوردہ صندوق سے چاندی کی موٹھ والی آبنوسی چھڑی نکالی۔ چھڑی ہاتھ میں لے کر انہیں ایک دفعہ پھر یہ احساس ہوا کہ دلاور علی ان کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ رکشا پر بیٹھے ہوئے وہ سوچ رہے تھے کہ میرے جاتے ہی شور مچ جائے گا "شیخ نجیب احمد آگئے"۔ دلاور کا نوکر میرے ہاتھ سے چھڑی لے کر کھونٹی سے ٹانگ دے گا۔ دلاور اٹھ کھڑا ہوگا۔ جھک کر سلام کرے گا اور میں کھڑے کھڑے اسے پچاسیوں گالیاں سناؤں گا۔ اور وہ میرے قدموں میں نوٹ ڈال کر مجھ سے معافی مانگے گا۔ اور میں ایک شان بے نیازی کے ساتھ واپس آجاؤں گا۔ آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں پر کتنا شاندار رعب پڑے گا۔ دلاور کے مکان کے پاس رکشا رکا وہ اترے۔

"ابھی رکو واپس بھی چلنا ہے۔"

شاندار مکان کے پاس کھڑی چمچماتی موٹر دیکھ کر انہوں نے سوچا چیرمین ہوتے ہی حرام کی موٹر خرید لی۔

لیکن موٹر کو دیکھتے ہی انھیں عجیب سا لگا۔ اپنے اوپر دلاور کی دولت کا رعب چھاتا ہوا محسوس ہوا۔ موٹر کے قریب سے گزرتے ہوئے جب موٹر کے چمکتے ہوئے سرخ رنگ کا

مسایہ ان کی سرمئی شیروانی پر پڑا تو انہیں ایسا لگا جیسے ان کی بات سنکر دلاور علی کا سیاہ چہرہ سرخ ہو گیا ہو۔

یہ سارے خیالات دماغ سے جھٹکتے ہوئے وہ دروازہ کے پاس آکر کھڑے ہوئے۔ کال بیل کو نظر انداز کرتے ہوئے انھوں نے چھڑی کی موٹھ سے دروازہ پر دستک دی۔ چھڑی کا صحیح مصرف آج ان کی سمجھ میں آیا۔ انہیں ایک عجیب سی فرحت کا احساس ہوا جیسے چھڑی کی موٹھ دروازہ پر نہیں دلاور کے سر پر پڑ رہی ہو۔

نوکر باہر آیا۔

"دلاور ہے؟"

"چیرمین دلاور علی کہو بڑے میاں۔"

انھوں نے سوچا نوجوان چھوکرا ہے، بات کرنے کی تمیز نہیں، جانتا نہیں میں کون ہوں، دلاور سے کہہ کر پہلے اسی کے کان مسلواؤں گا۔

"اچھا بھئی ان سے کہہ دو شیخ نجیب احمد آئے ہیں۔"

نوکر معنی خیز مسکراہٹ ہونٹوں میں دبائے اندر گیا۔ چند لمحوں کے بعد واپس آیا اور بولا "جاؤ اندر بیٹھے ہیں۔"

پیر پٹختے ہوئے وہ ڈرائنگ روم کے دروازے تک آئے۔ ایک بار پھر اپنا جائزہ لیا۔ اسکارف احتیاط سے لپیٹا اور دروازے میں جا کر کھڑے ہو گئے۔ کچھ لمحوں تک انھوں نے انتظار کیا کہ دلاور اٹھ کر سلام کرے اور انھیں اپنی جگہ لے جا کر بٹھائے۔ لیکن یہ کچھ نہ ہوا۔ زمینداری ختم ہو جانے کے بعد انھیں کچھ مجلس کے آداب آگئے تھے۔ آہستہ سے سلام کیا۔

چیرمین دلاور علی نے ہاتھ کے اشارے سے سلام کا جواب دیا۔ وہ ایک شاندار صوفے پر آدمیوں میں گھرا بیٹھا تھا۔ ہاتھ کے اشارے سے ہی اس نے انھیں بیٹھنے کو کہا۔

شیخ صاحب ایک کرسی پر پھیل کر بیٹھ گئے۔ چاروں طرف نگاہ پھینکی۔ خوبصورت اور قیمتی پینٹنگ دیواروں میں آویزاں تھیں۔ شیشے کے خوبصورت کھلونے ایک طرف سلیقے سے سجے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی مشین کے پاس رکھا ہوا بڑا سا ٹیلی ویزن.... اور جانے کیا کیا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر لاشعوری طور پر ان کا پھیلا ہوا جسم کرسی میں سکڑ گیا۔ جیسے وہ اپنی شخصیت چھپانا چاہتے ہوں۔

دلاور کسی سے زوردار آواز میں باتیں کر رہا تھا۔ اس شخص پر جب ان کی نگاہ پڑی تو انہیں تعجب ہوا۔ مقبول میاں دلاور علی کے سامنے ایک چور کی طرح بیٹھے ہوئے تھے، سر جھکائے ہوئے تھکے تھکے سے۔ ان کے ہاتھ میں چائے کی پیالی کانپ رہی تھی۔ شیخ صاحب کو بھی چائے دی گئی۔ اور وہ سوچ رہے تھے یہ وہی مقبول میاں ہیں جو انہیں کی نکر کے زمیندار تھے، جنکے پھاٹک پر ہاتھی جھومتا تھا اور کہار پٹریاں پیتے تھے۔ اور آج وہی دلاور کے سامنے سر جھکائے بیٹھے ہیں اور دلاور علی ان سے پوچھ رہا ہے۔

"آخر میں پوچھتا ہوں آپ کی ہمت کیسے ہوئی کہ آپ کسی سے کہہ سکیں کہ میرا باپ آپ کے باغ سے ترکاری چرا کر لاتا تھا۔ ہوش میں رہیے مقبول میاں، یہاں کا رہنا بھلا دوں گا، سمجھے۔"

اور مقبول میاں کے ہاتھ میں چائے کی پیالی یکبارگی زور سے کانپی اور چھوٹ کر گر پڑی۔ اور ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ ان کے چہرے پر ایسی وحشت برسنے لگی جیسے چائے کی پیالی کے ساتھ ان کی ساری عزت اور وضعداری ٹوٹ کر بکھر گئی ہو۔

شیخ نجیب احمد نے محسوس کیا ان کے ہاتھ میں بھی پیالی کانپ رہی ہے، دلاور علی ان کی طرف مخاطب ہوا۔

"کہیئے شیخ جی کیسے آنا ہوا؟"

شیخ صاحب نے بڑی کوشش سے کانپتی ہوئی پیالی کو گرنے سے روکا، حواس یکجا کئے کھنکارے اور بولے۔

"میں..... میں....." اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے ہزاروں چیزیں ان کے دماغ میں گڈمڈ ہو رہی ہیں۔ انھیں تھوڑی دیر کے لئے ایسا محسوس ہوا جیسے ان کا دماغ بھی سامنے رکھے ہوئے ٹیبل فین کی طرح ہے جس کے سارے پنکھ ٹوٹ کر اندر ہی اندر ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں۔

دلاور علی کی چبھتی ہوئی نظروں نے ان کے ہونٹوں پر پڑے قفل کو توڑ دیا اور معلوم نہیں کیا ہوا، ان کی زبان سے بس یہی نکلا، "میں..... میں نے سوچا آپ چیرمین ہو گئے ہیں، آپ کو مبارک باد دے آؤں۔"

"اچھا اچھا، یہ لیجئے" اس نے سوکھے میووں کی پلیٹ کی طرف اشارہ کیا اور تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ

لئے۔

رکشے میں پیچھے راستے بھر انھوں نے کچھ نہیں سوچا۔ بس رکشے کے پیڈلوں کو دیکھتے رہے۔ ایک پیڈل اوپر سے نیچے کی طرف جاتا ہے اور دوسرا پیڈل ایک دم سے نیچے سے اوپر آجاتا ہے اور یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوجاتا ہے کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کب اوپر والا پیڈل نیچے آگیا اور نیچے والا اوپر اٹھ آیا۔

ٹوٹے ہوئے دروازوں سے نگاہیں چراتے ہوئے وہ گھر کے اندر داخل ہوئے۔ آنبوسی چھڑی کھونٹی سے لٹکائی۔ سرفراز کو آواز دی اور کہا۔

"بیٹا میں نے دلاور کو بہت ڈانٹا، وہ کمینہ معافی مانگنے لگا، مجھے بھی ترس آگیا۔ اب اس سے یا اس کے بچوں سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اور اندر کمرے میں آکر شیروانی اتارتے ہوئے وہ سوچ رہے تھے اگر آج مقبول میاں کی طرح ان کے ہاتھ سے بھی چائے کی پیالی گر کر ٹوٹ جاتی تو کیا ہوتا ..... ؟

○○

قدیم معبدوں کا محافظ

قدیم معبدوں کا محافظ

(نذر نیاز مسعود)

پرانی عبادت گاہوں میں جانا، ان کے در و دیوار کو دیر تک دیکھتے رہنا اور ان کے اندرونی نیم تاریک نم حصوں میں پہنچ کر سونگھ سونگھ کر پرانے پن کو محسوس کرنا میرا پچپن کا مشغلہ ہے۔ ایسا میں جب کرتا ہوں جب غروب کا وقت ہوتا ہے اور اندھیرے کی پوشاک پہن کر درخت چپ چاپ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ وقت کی اس کیفیت میں ایک ایسی اداسی ہوتی ہے جسے کوشش کے باوجود لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ اس کیفیت کی مماثلت ماضی کے کچھ واقعات میں تلاش کی جاسکتی ہے لیکن دقت یہ ہے کہ ماضی کے ان واقعات کو بھی صرف یاد کیا جاسکتا ہے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ میرا مسئلہ مختلف ہے بلکہ برعکس۔ میں ماضی کے واقعات یاد کرتا ہوں اور جب ان کو بعینہٖ بیان نہ کر پانے کی شدید الجھن میں گرفتار ہوتا ہوں تو ان واقعات کی مماثلت ڈھونڈنے پرانی عبادت گاہوں کے نیم تاریک اندرونی نم حصوں میں پہنچ جاتا ہوں۔

اس دن بھی سورج غروب ہونے ہی والا تھا اور درخت اندھیرے کی پوشاک پہن کر چپ چاپ گم سم کھڑے تھے۔ بستی سے آنی والی سڑک کے بائیں طرف آم کے پرانے باغوں کو عبور کر کے میں اس قدیم عمارت میں داخل ہوا جس کے صدر دروازے پر کسی مضبوط عمارتی لکڑی کے دروازے ابھی تک سلامت تھے حالاں کہ فرش اور چہار دیواری شکستہ ہونے کی وجہ سے صدر دروازہ کھولنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ یوں بھی صدر دروازے پر ایک سیاہ رنگ کا زنگ خوردہ قفل لٹکا رہتا تھا۔ قفل کے اصل رنگ میں زنگ کی زردی مائل سرخی نے مل کر ایک ایسے رنگ کی آمیزش کر دی تھی کہ قفل اپنی اصل عمر سے زیادہ قدیم محسوس ہوتا تھا۔ شکستہ دیواروں کے آس پاس کانٹے دار جھاڑیوں کو پھلانگ کر جب میں اندر کے ٹوٹے پھوٹے فرش پر قدم جمائے کھڑا تھا تو عمارت کے

دوسرے دالانوں میں سے کوئی پرندہ چیخیں مارتا نکلا تھا۔ مجھے تھوڑی دیر بعد علم ہو پایا کہ وہ کوئی پرندہ نہیں ایک چمگادڑ تھا۔ مجھے تاریکی، تنہائی اور مافوق الفطرت عناصر سے خوف نہیں محسوس ہوتا کیوں کہ میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کے زیادہ تر حصے ہمیشہ تاریک رہتے ہیں، اتنے تاریک کہ اگر کبھی کسی تقریب کے وقت وہاں لالٹین سے روشنی بھی کی جائے تو وہ جگہ اس مکان کا حصہ نہیں لگتی۔ میرے عزیز خصوصاً والدین بچپن سے ہی مجھ سے بیزار ہیں کیوں کہ ان کے خیال کے مطابق میں خراب صحبت میں وقت گزارتا ہوں۔ یوں اس مکان میں میرا جو بھی وقت گزرا ہے وہ تاریکی اور تنہائی میں ہی گزرا ہے تاریکی اور تنہائی میرے لئے ایسے لازم و ملزوم ہیں جیسے کرتے کی ایک آستین میں ہاتھ ڈال کر دوسری آستین میں ہاتھ ڈالنا۔ میں جہاں بھی تاریکی دیکھتا ہوں مجھے تنہائی کا خیال آجاتا ہے اور جہاں بھی تنہائی دیکھتا ہوں، تاریکی کا احساس ہونے لگتا ہے کبھی کبھی ان دونوں کیفیتوں کا احساس یک وقت ہوتا ہے اور کبھی کبھی ان دونوں کیفیتوں کے احساس کے درمیان زمانی وقت کا ایک مختصر سا ٹکڑا حائل ہوجاتا ہے۔ مجھے سب سے زیادہ اذیت اسی مختصر سے لمحے میں محسوس ہوتی ہے۔ اس وقت مجھے لگتا ہے کہ اگر تاریکی کے باوجود تنہائی نہیں ہے تو اس میں کوئی بڑا اسرار ہے اور اگر تنہائی کے باوجود تاریکی نہیں ہے تو اس کے پس پشت کسی آسیب کا ہاتھ ہے۔

اس شام چمگادڑ کی چیخ نے تاریکی یا تنہائی کے احساس کو کم نہیں بلکہ مزید واضح کیا۔ اور یوں وہ چیخ مجھے روشنی کی ایک لکیر کی طرح محسوس ہوئی جو تاریکی اور تنہائی کو روشن کرتی ہوئی آہستہ آہستہ معدوم ہوگئی۔

فرش پر گھٹنوں گھٹنوں گھاس اگی ہوئی تھی زمین والے سے بچنے کے لئے میں فرش پر آنکھیں گڑا گڑا کر قدم رکھ رہا تھا اور اسی طرح احتیاط سے چلتے چلتے میں اگلے دالان میں آگیا۔ اس دالان کا فرش بھٹے میں پکی ہوئی اینٹوں سے تعمیر کیا ہوا لگ رہا تھا۔ ان اینٹوں کی شکل عام اینٹوں سے مختلف مربعے کی صورت کی تھی ان مربعوں پر مختلف شکلیں بنی ہوئی تھیں لیکن میں ان شکلوں میں کوئی مذہبی عنصر نہیں تلاش کرسکا ہلکی روشنی میں

صرف اتنا نظر آیا کہ وہ نقوش عورتوں سے متعلق ہیں اور زیادہ تر برہنہ عورتوں کے اعضاء ہیں جو بہت باریکی اور صفائی سے تراشے گئے ہیں۔ ان نقوش پر گہرے سبز رنگ کی کائی جمی ہوئی تھی اور اس طرح ہر عورت گہرے سبز رنگ کا لبادہ پہنے لگ رہی تھی۔

اندر کے دالان کا فرش پکا تھا اور وہاں بھی گھاس اگ آئی تھی۔ غروب شدہ سورج کی زرد روشنی میں وہ گھاس سیاہ رنگ کی محسوس ہو رہی تھی۔ ان دونوں دالانوں کے بعد وہ حصہ تھا جس کو تین دروازوں نے بند کر رکھا تھا۔ یہی اصل عبادت خانہ تھا۔

درمیانی دروازے کو ہلکے سے دھکا دیا تو وہ ایک کمزور سی آواز کے ساتھ سے کھل گیا اس حصے میں تاریکی برائے نام تھی کیوں کہ سامنے کی دیوار پر روشن دان کھلے ہوئے تھے مجھے حیرت ہوئی کہ میں نے عمارت کی پشت پر ان روشن دانوں کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ روشن دانوں کے نچلے حصوں سے مٹی کے رنگ کی بہت سی دھاریاں دیوار پر سے ہوتی ہوئی فرش تک آ رہی تھیں۔ دیوار سے لگا ہوا ایک چھوٹا سا چبوترا تھا جس میں تین سیڑھیاں لگی ہوئی تھیں حالانکہ چبوترے کی کل اونچائی اتنی نہیں تھی کہ چبوترے پر پہنچنے کے لئے ان سیڑھیوں پر چڑھنے کی ضرورت پیش آئے۔ اس چبوترے پر ایک بڑی سی مربع صورت اینٹ جمی ہوئی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا اس بڑی اینٹ پر کوئی نقش نہیں تھا صرف کائی کی دبیز تہہ تھی۔

کیوں کہ میں مافوق الفطرت عناصر سے نہیں ڈرتا اس لئے میں نے اس چبوترے کے پاس بیٹھے زانو پہ سر رکھے بوڑھے سے دریافت کیا کہ وہ کون ہے۔

"میں ایک بے ذوق انسان ہوں" اس نے نگاہیں اٹھائے بغیر مختصر سا جواب دیا۔

میں اس کے جواب میں چھپی گہرائی کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا اسی وقت مجھے احساس ہوا کہ باہر کے دالان کے فرش پر کندہ حسین نقوش شاید اسی بوڑھے کے ہاتھوں کا کمال ہوں۔ میں صبر نہیں کر سکا۔

"کیا باہر دالان کے فرش کے نقوش آپ نے بنائے ہیں؟"۔

"نہیں۔"

پھر ؟۔

''یہ سوال ضروری نہیں ہے۔''

''لیکن آپ اس کا جواب جانتے ہیں، بتایئے کس نے بنائے ہیں؟''

بوڑھے نے مجھے مسکرا کر غور سے دیکھا۔ یہ وہ لمحہ تھا جس میں مجھے خوف محسوس ہوا کیوں کہ یہ تنہائی تاریکی اور مافوق الفطرت عناصر۔ سب سے مختلف کیفیت کا حامل لمحہ تھا۔

چلتے چلتے میں نے اس سے پوچھا۔

''اس علاقے میں ایسے کئی معبد ہیں۔ کیا آپ نے کسی معبد کے نقش و نگار نہیں بنائے؟''

''نہیں۔''

''پھر آپ کا کام کیا ہے؟''

''حفاظت کرنا''۔

''کس چیز کی۔ ۔ ۔ کس سے ؟''

''کسی بھی نقصان پہنچانے والے سے۔ تم بھی ان میں سے ایک ہو''

''میں؟'' اس کی سنجیدہ آنکھوں کو اندھیرے کے باوجود برداشت نہیں کرسکا۔ ہمت کرکے پوچھا۔

''میں بھلا کیوں کر نقصان پہنچا سکتا ہوں؟''

''فراموش کرکے۔ ہر چیز فراموش کرکے''۔

''میں سمجھا نہیں''۔ میں نے جاتے جاتے اس سے پوچھا۔ ''میں نے کیا فراموش کیا؟''۔

جب میں شکستہ دیواروں کو پھلانگ کر واپس نکل رہا تھا تو اس نے بلند آواز میں مجھے مخاطب کرکے کہا۔

''تم نے یہ بڑی حقیقت فراموش کردی ہے کہ ان پرانے معبدوں کے معمار تم ہی تو تھے''

اس رات جب میں بستی میں پہنچا تو اپنا تاریک اور تنہا مکان بہت دیر میں پہچان سکا۔

قربانی کا جانور

چکّر

سورج ابھی نہر کے پانی میں غوطہ لگائے تھا۔ صبح کی سفیدی آسمان کے کنارے پر پھیل چکی تھی۔ ملگجے گہرے رنگ کے آسمان کے کنارے پہ سفیدی ایسی لگ رہی تھی جیسے ارہر کے جوان ہرے بھرے کھیتوں کے چاروں طرف کھنچی ہوئی سفید چکنی مٹیر یں۔

ہرنوں کا غول بیٹھا جگالی کر رہا تھا۔ اکا دکا ہرن کھڑے تھے۔ بچے کلیلیں کر رہے تھے۔ اور کچھ مادائیں کھڑی چوکنا نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھیں۔ ہوا زور سے چلتی تو ایکھ کے کھیتوں میں سرسراہٹ ہوتی اور ہرنیاں تڑپ کر کنوتیاں بدل بدل کر کان ہلا ہلا کر ایکھ کے کھیتوں کی طرف آنکھیں گاڑ دیتیں اور اس وقت تک بت بنی ادھر ہی دیکھتی رہتیں جب تک کہ کسی اور طرف سے کوئی اور آواز نہ سنائی دیتی۔

بوڑھا سردار ببول کے بڑے درخت کے چھدرے سائے میں بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ کچھ پرانی مادائیں زمین پر پیر مار مار کر اسے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی پرانی مادہ اس کے بوڑھے جسم کو سونگھ لیتی جیسے اپنے تحفظ کا یقین چاہتی ہو۔

سردار بہت بوڑھا ہو چلا ہے۔ گہرے سیاہ رنگ کا بدن اب مٹیالا سا ہو گیا ہے۔ جب اس رنگ پر بہت سی گرمیاں، بہت سی سردیاں اور بہت سی برساتیں گزر جاتی ہیں تو بدن ایسا ہی مٹیالا ہو جاتا ہے۔ گردن اور بازوؤں کے جوڑوں پر کالے کالے ڈھٹے پڑ گئے ہیں جو اسکی آرام طلبی کی نشان دہی کرتے ہیں۔ جسم پر جگہ جگہ چھروں کے نشانات دیہاتی شکاریوں کے اناڑی پن کی دلیل ہیں۔ اس کی پشت کا سیاہ رونگٹا بالکل جھڑ گیا ہے اور وہاں جگہ جگہ پھنسیوں کے نشان ہیں جن پر بار بار مکھیاں بیٹھ جاتی ہیں اور وہ انھیں بار بار دم ہلا کر اڑا دیتا ہے اور مکھیاں پھر بیٹھ جاتی ہیں۔ چھوٹے سے سر پر ایک بل کھایا ہوا سیاہ سینگ ہے جو جگہ جگہ سے چٹخنے لگا ہے اور اسکی چٹخن کی دراروں میں دھول جم گئی ہے اور

قُربانی کا جانور

ظفر بھونچکا بیٹھا تھا۔

عائشہ نے سویّوں کا پیالہ ہاتھ میں دیتے ہوئے پوچھا۔

''پھر کیا کہا میڈم نے؟''

''کہا کہ لڑکا ۱۳— ۱۴ سال کا ہو۔ کسی اچھے گھر کا ہو، گھریلو کام کاج کا تھوڑا بہت تجربہ ہو۔ آنکھ نہ ملاتا ہو۔ صاف ستھرا رہتا ہو، تنخواہ زیادہ نہ مانگے۔ ناغہ نہ کرے— مہینے پیچھے پگار اور روزانہ تین وقت کا کھانا بھی تو ملے گا۔''

''پھر؟''

پھر کیا؟

''مطلب کہیں تلاش کیا؟''

تلاش کا کون سا وقت ملا۔ بقرعید کی نماز کے بعد سیدھا صاحب کو سلام کرنے چلا گیا تھا وہیں سے چلا آرہا ہوں۔ نوکر اتنی آسانی سے تھوڑے ہی مل پاتے ہیں۔ پھر اتنی زیادہ شرطیں۔ مجھے تو بہت مشکل نظر آتا ہے۔ ظفر کی آواز بھرّا گئی۔

''آپ اتنے پریشان کیوں ہیں۔ ہم لوگ اپنا تیوہار کیوں خراب کریں۔ ایک آدھ ہفتے میں تلاش کرلیں گے''۔ عایشہ نے دلاسہ دیا۔

''میڈم نے کہا ہے پرسوں تک انتظام ہوجانا چاہیے پرانی والی بائی اپنے وطن واپس چلی گئی ہے''۔ ظفر نے جواب دیا ''ایک آدھ ہفتے گھر کا کام خود نہیں سنبھال پائیں گی کیا۔ اتنی نازک ہیں؟'' عایشہ عورت بن گئی۔

''تم بات سمجھتی نہیں ہو۔ بلاوجہ کی بحث کرتی ہو۔ مکان کے لئے اپلائی کیا ہے عایشہ! صاحب دوچار دن کے اندر فیصلہ کرنے والے ہیں کہ مکان کس کو ملے گا''۔ ظفر نے سمجھایا۔ مکان کا ذکر سن کر عایشہ کے ماتھے کی سلوٹیں کھل گئیں۔ آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی قریب بیٹھ کر پوچھا۔

''ظفر تم نے وہ مکان دیکھا ہے۔ کتنے کمرے ہیں؟''

''دو روم ہال کچن۔ ایک چھوٹی سی بالکنی بھی۔''

''بالکنی بھی۔ سچ مچ؟ عائشہ کے منہ سے بس اتنا ہی نکلا اور اسنے وہیں بیٹھے بیٹھے نگاہیں گھما کر پورے کمرے کا جائزہ لیا۔ چودہ بائی بارہ کا چوتھے مالے کا تاریک کمرہ۔ ٹوٹے شیشے کی کھڑکی کے پاس ڈبل بیڈ جس کے نیچے ایک دوسرے سے ملا کر رکھے گئے ٹرنک اور سوٹ کیس۔ دروازے کے پاس میز پر رکھا ٹی وی۔ اسی میز کے نیچے دری کے چوکور ٹکڑے پر بچوں کے کورس کی کتابیں کاپیاں، کمرے کو بیچ سے دو کرتی ہوئی الگنی جس پہ لٹکے ہوئے ہر سائز کے گیلے گیلے کپڑے، بچوں کو ڈانٹتے وقت ان کا چہرہ دیکھنے کے لئے، جنکو دائیں بائیں سرکانا پڑتا ہے۔ دروازے کے پیچھے بڑوں اور بچوں کے جوتے چپلیں جن کی وجہ سے دروازہ پورا نہیں کھل پاتا تھا۔ ضروریات کے لئے دوسرے مالے پر اتر کر مشترکہ غسل خانہ اور لیٹرین۔ باتھ روم کا خیال آتے ہی اس نے نگاہیں گھمانا بند کر کے ذہن دوڑانا شروع کر دیا تھا۔ دو کمرے۔ ہال اور کچن الگ اور اس پر سے ایک بالکونی بھی جہاں گھر بھر کے کپڑے سکھائے جاسکتے ہیں۔ بمبئی میں تو یہ عیش نہیں عیاشی ہوگی۔ کچن کے پلیٹ فارم پر چولہا رکھا ہو تو مکان گھر لگنے لگتا ہے۔ وہیں کے وہیں برتن دھونے کے لئے نل بھی ضرور ہوگا۔ سبھی سرکاری گھروں میں ہوتا ہے۔ دو مالے نیچے برتن لاد کر نہیں اترنا ہوگا۔ ہال کو ڈرائنگ روم بنائیں گے جیسا لکھنؤ میں رکاب گنج والے مکان میں بنایا تھا۔ اپنا فرنیچر اور دیگر سامان بھی منگالیں گے جو اسی مکان کے ایک کمرے میں بند پڑا سڑ رہا ہوگا اور جسے ہٹانے کے لئے مالک مکان کا ایک اور نئے کرایے دار کے تین خط آچکے ہیں۔

ایک کمرہ بچوں کا۔ وہیں ان کی میز کرسی کتابیں کاپیاں اور کپڑوں کے ٹرنک۔ دوسرے کمرے میں صرف ایک الماری اور ڈبل بیڈ۔ عائشہ نے چپکے سے نگاہیں اٹھا کر شوق کے ساتھ اپنے ادھیڑ ہوتے شوہر کو دیکھا۔ بڑے ہوتے بچوں کی موجودگی میں تو ظفر کے پاس بیٹھنے تک میں حجاب آتا ہے۔ ظفر نے کچھ سوچتے سوچتے نگاہیں اٹھائیں۔ بیوی کے رنگ بدلتے چہرے کو دیکھا مسکرانے کی کوشش کی اور بولا۔

''میں بھی وہی سب کچھ سوچ رہا ہوں عشو۔ مگر خالی سوچنے سے کیا ہوگا''۔

''ایسا کرتے ہیں آج بقر عید میں کسی سے ملنے نہیں جائیں گے۔'' عایشہ بولی ''بچوں کو پڑوس میں چھوڑ کر شہر کا ایک چکر لگاتے ہیں کوئی نہ کوئی لڑکا مل ہی جائے گا۔ آپ بکرا بھی نہیں لائے۔''

''وقت ہی کہاں ملا عایشہ بتایا تو صاحب کے یہاں سے سیدھا گھر ہی آرہا ہوں۔ ویسے بھی ہم نے پچھلے سال کب قربانی دی تھی۔''

''اس کا نتیجہ دیکھ تو لیا۔ اچھے بھلے لکھنؤ میں بیٹھے تھے۔ اچانک آپ کو بمبئی دے مارا جہاں یہ کھٹولے برابر کا کمرہ رہنے کو ملا ہے''۔

ظفر چپ رہا۔ عایشہ کو یہ وار خالی جاتا نظر آیا اس نے کچھ بلندی سے معاملہ پھر اپنے ہاتھ میں لیا۔

''آپ صاحب نصاب ہیں؟''

''تمہارے زیور اور سرکاری فنڈ کی وجہ سے''

''میں تو؟''

''ہاں ہوں تو۔''

''صاحب نصاب پر قربانی فرض ہے؟''

''ہاں'' ظفر نے مری مری آواز میں جواب دیا۔

''یہ فرض پورا نہ ہو تو آخرت میں معلوم ہے کیا ہوتا ہے؟''۔

''کیا ہوتا ہے؟'' ظفر نے بن کر پوچھا۔ کل ہی اس سلسلے میں عایشہ نے قربانی کی اہمیت، قربانی کے جانور کی تندرستی، عدم ادائیگی کی سزا، پل صراط کی باریکی اور تیزی، دوزخ کی آگ اور قیامت کے عذاب کا نقشہ تفصیلی جزئیات کے ساتھ کھینچا تھا۔

ظفر نے دیکھا ایک بڑے سے میدان میں ہزار ہا ہزار خلقت جمع ہے۔ ریت کے ایک بڑے سے میدان میں ایک قد آدم ترازو رکھا ہے۔ اس کے ایک پلڑے میں اس کے نیک اعمال ہیں اور دوسرے میں بداعمالیاں۔ دوسرا پلڑا بوجھ کے سبب زمین سے لگا جارہا ہے

اور وہیں سب کے درمیان مگر سب سے جدا خدائے ذوالجلال ایک نور کے پیکر کی صورت میں جلوہ گر ہے اور اس پیکر پر نگاہیں نہیں ٹھہر رہی ہیں۔ وہیں نزدیک ہی نیک اعمال کا معلن سفید پروں والا فرشتہ شرمندہ کھڑا ظفر کو دیکھ رہا ہے اور ادھر سرخ پروں والا فرشتہ بلند آواز میں اعلان کررہا ہے کہ زرینہ خاتون کے بیٹے ظفر احمد نے فلاں سن میں صاحب نصاب ہونے کے باوجود بقر عید کے موقعے پر قربانی نہیں دی اس نے بچپن میں سن رکھا تھا کہ قیامت میں لوگوں کو ان کی ماں کے نام سے پکارا جائے گا۔ سرخ فرشتے کے اس اعلان پر اس کے سارے دوست احباب کھڑے کھڑے ٹھٹھے لگا رہے ہیں، پھر وہ دوست احباب مضبوط اوٹوں ، تندرست گایوں بھینسوں اور خوب صورت بکروں اور مینڈھوں پر بیٹھ کر مسکراتے ہوئے فخریہ انداز سے پل صراط پار کررہے ہیں۔ اور جب وہ عایشہ اور بچوں کو لے کر پل پار کرنے کے لئے آگے بڑھا تو پل کو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز پایا۔ پہلا قدم رکھتے ہی سب کے بدن بیچ سے دو ہوگئے اور نیچے اس آگ میں گر کر انگاروں کی طرح بھڑکنے لگے جس کے شعلے آسمان سے باتیں کررہے تھے۔ اس کے دوست احباب پیچھے مڑکر نیچے دیکھتے ہوئے آپس میں کہہ رہے ہیں کہ اگر ظفر نے قربانی دی ہوتی تو اس وقت وہ بھی اسی جانور کو سواری بنا کر اطمینان سے یہ پل پار کر رہا ہوتا۔

''چلو پہلے لڑکے کو تلاش کرلائیں''۔ عایشہ اسے وہاں سے کھینچ لائی ''قربانی کا وقت تو تین دن تک رہتا ہے''۔

دوپہر سے گھومتے گھومتے شام ہوگئی۔ کئی بسیں بدلیں۔ دو دفعہ ٹیکسی بھی کرنا پڑی مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ وہ دونوں غروب ہوتے سورج کے سامنے حاجی علی کی درگاہ کے مقابل سمندر کی فصیل پر خاموش بیٹھے تھے۔ ۱۲— ۱۳ برس کا ایک لڑکا بھیک مانگتا ان کے پاس آیا۔ ظفر نے گردن موڑ کر دیکھا اور بیزاری سے منہ پھیر لیا۔ مگر عایشہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''سنو ظفر اس سے بات کریں؟''

ظفر نے اسے پھر دیکھنا ضروری سمجھا۔ وہ میلے میلے کپڑے پہنے ہاتھوں میں گندی گندی پٹیاں باندھے، خالی خالی آنکھیں لیئے ان کے سامنے کھڑا تھا۔ عورت مرد کو آپس میں سرگوشیاں کرتے سن کر اسے بھیک ملنے کی امید بندھ گئی تھی۔

''کام کرو گے گھر کا—؟'' اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دے۔ ''وہاں تین وقت کا کھانا ملے گا۔ بجلی کا پنکھا ہر وقت چلے گا۔ نہانے کو ملے گا۔ صاف کپڑے بھی۔'' اس کی گردن پر جمے میل کو دیکھ کر اور میڈم کے اسی عمر کے بچوں کا خیال کرکے اس نے یہ بات کہی تھی۔

لڑکے نے اس کی باتیں بہت مایوسی سے سنیں۔

''نئیں۔ اپن کو اسی جگہ پہنچ دھندا کرنا ہے۔ اپنے والے سب لوگ ادھر بیچ ہیں۔ اماں، باپ بہنیں سب''

وہ دونوں ہکا بکا اسے دیکھتے رہے اور وہ آگے بڑھ کر کسی دوسرے آدمی سے دھندا کرنے لگا۔

وہ دونوں بہت ناامید گھر واپس آئے اور بچوں کو ان حرکتوں پر ڈانٹ کر سوگئے جو ان کے خیال کے مطابق ان کی غیر موجودگی میں بچوں نے کی ہوں گی۔

دوسرے دن آفس میں صاحب نے نوکر کے بارے میں پوچھا۔

''آپ کل تک انتظار کریں سر۔ تقریباً سارا انتظام ہوچکا ہے''۔

وہ گھبراہٹ میں جھوٹ بول گیا۔ وہ آفس کے وقت سے پہلے ہی گھر واپس آگیا۔ عائشہ دروازے پر اس کی منتظر تھی۔

''بتایئے اندر کون ہے؟''

''کیا کوئی مہمان آیا ہے؟ اس نے گھبرا کر پوچھا۔

''مہمان ہی سمجھ لیجئے''

وہ جلدی سے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے کے وسط میں بڑی میز کے پایے سے بندھا ایک سیاہ بکرا دونوں ٹانگیں جوڑے، سر نیوڑھائے، سینگ تانے اس کا منتظر تھا۔

''یہ تم نے اچھا کیا۔ مجھے تو وقت ہی نہیں مل پا رہا تھا'' ظفر نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا پھر بکرے کا بھر پور جائزہ لیا۔ قریب آکر اس کے دونوں کان غور سے دیکھے اور ان کو چھوا۔ پھر اس کی دم دیکھی پھر آگے آکر اس کے سینگوں کا بغور معاینہ کیا۔ پھر پیچھے جاکر اس کی ٹانگیں ایک ایک کر کے دیکھیں۔

''کیا دیکھ رہے ہیں اتنے غور سے؟'' عایشہ نے پوچھا۔

''کوئی عضو کوئی حصہ کٹا پھٹا، ٹوٹا پھوٹا نہیں ہونا چاہئے۔ جانور مکمل طور سے تندرست ہونا چاہئے یہ ہماری پل صراط کی سواری ہے عایشہ۔''

''بے شک'' عایشہ نے خدا ترسی والے انداز میں تائید کی۔ دونوں بچے بکرے کو گیہوں کے دانے اور روٹی کے ٹکڑے کھلانے لگے۔

''آفس میں صاحب نے نوکر کے بارے میں پوچھا تو میرے منھ سے نکل گیا کہ تقریباً سارا انتظام ہوگیا ہے۔ میں جھوٹ بولنا نہیں چاہ رہا تھا مگر انجانے میں ایسا ہوگیا۔''

''جھوٹ کی کیا بات ہے۔ ہم لوگ کل اپنا تیوہار چھوڑ کر شہر بھر میں مارے مارے نہیں پھرتے رہے کیا؟ قربانی تک نہیں کر پائے۔ ہماری نیت تو یہی رہی نا کہ نوکر مل جائے۔''

''نیت کا ثواب صرف اللہ میاں والے کاموں میں ملتا ہے۔ صاحب اور میڈم کو نوکر چاہئے۔ نوکر تلاش کرنے کی نیت نہیں۔''

''تم کل کی چھٹی لے لو۔ کل دن بھر میں کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گا۔ عایشہ نے اسے مشورہ دیا۔

ظفر کو اس کی بات معقول لگی۔ نیچے جاکر اس نے پبلک بوتھ سے صاحب کے مکان پر فون کیا۔

دوسری طرف میڈم نے فون اٹھایا۔ وہ گھبرایا گیا۔

''دراصل بات یہ ہے میڈم کہ لڑکے کو اس کے گھر سے لانے میں بہت وقت لگ جائے گا۔ اس لئے صاحب سے کل کی چھٹی کی بات کرنی تھی''۔

''آپ چھٹی کی فکر نہ کریں بس نوکر پانچ بجے شام تک ضرور پہنچادیں۔ آپ کو یاد ہے نا میں

نے اس کے بارے میں کیا کیا بتایا تھا۔ زیادہ سیلری تو نہیں مانگتا ہے؟"

"جی ہاں ویسا ہی تلاش کیا ہے۔ جی نہیں پگار زیادہ نہیں ہے۔"

وہ جھوٹ پر جھوٹ بولتا جارہا تھا۔ "صاحب کو میری مکان والی بات ضرور یاد دلا دیجئے گا پلیز۔"

"میں کہہ دوں گی مگر صاحب آج کل آپ سے بہت زیادہ خوش نظر نہیں آرہے۔" میڈم نے جذبے سے عاری آواز میں اسے مطلع کیا۔ اس اطلاع سے اسکا دل بجھ گیا۔ وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔

میڈم کو اس کی خاموشی پر شاید رحم آگیا۔

"کل جب آپ نوکر لے کر آئیں گے تو شاید صاحب خوش ہوجائیں۔ اسی موقعے پر آپ کے جانے کے بعد میں ریکمنڈ کردوں گی۔"

"تھینک یو۔ تھینک یو ویری مچ میڈم" فون رکھ کر جب وہ گھر میں داخل ہوا تو ناامید نہیں تھا۔ صبح ۸ بجے سے ۴ بجے شام تک تلاش کرنے پر نوکر ضرور مل جائے گا۔

"اسے قصائی کے یہاں جاکر ذبح کرادیجئے۔ کل معلوم نہیں وقت ملے نہ ملے۔"

"تم فکر مت کرو عایشہ۔ ویسے بھی اب جوگیشوری تک جاتے جاتے رات ہوجائے گی۔ کل شام تک بہت وقت پڑا ہے"۔ ظفر نے اسے تھپتھپایا۔

"بس کل مغرب تک کا وقت ہے اسکی قربانی کا۔ پھر قبول نہیں ہوگی۔ آپ جانتے ہیں کہ قیامت کے روز سفید پروں والا فرشتہ ہماری وجہ سے شرمندہ ہوگا اور سرخ پروں والا فرشتہ ہمارے اعمال کی خبر فوراً اللہ تعالی کو دے گا"۔ عایشہ نے پھر آخرت کا نقشہ کھینچنا شروع کردیا۔

"تم بے فکر رہو عایشہ"۔ ظفر نے بکرے کو کونے میں باندھتے ہوئے جواب دیا۔ اور اس کی پھیلائی ہوئی گندگی کو سمیٹ کر عایشہ نے باہر رکھے کوڑے دان میں ڈال دیا اور ادھر اُدھر دیکھ کر اس پر آج کا اخبار ڈھک دیا۔

صبح آٹھ بجے آٹو میں بیٹھ کر دونوں نے نقشہ بنایا کہ شہر کو کیسے کیسے کور کرنا ہے۔

بیچ بیچ میں عایشہ نئے مکان کے دروازوں اور کھڑکیوں کے پردوں کے رنگ کے بارے میں اس سے پوچھتے رہی۔

آرے ملک کالونی کے پارک کے اطراف تمام جھگیوں کے چکر لگا کر، جوگیشوری، اندھیری سانتاکروز، کالینہ کرلا اور پھر ہائی وے پر آگر باندرہ تک کے تمام امکانی مقامات دیکھ ڈالے۔ نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ ایک بج گیا۔ عایشہ کا دل ڈوبنے لگا۔ اسے انڈین آئیل کی عمارت کے پیچھے پھیلی ہوئی تمام انسانی آبادی اجنبی محسوس ہوئی۔ حد نظر تک پھیلے ہوئے مکانوں کے مکینوں کے خلاف ایک زبردست تفرت کاجذبہ اس کے دل میں شعلے بن کر اٹھا۔ وہ شعلہ آہستہ آہستہ بیٹھ گیا اور سینے میں گھٹن سی ہونے لگی۔

اس نے روہانسے انداز میں ظفر کی طرف دیکھا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ظفر کا دل بھی کمزور ہوگیا۔ وہ دونوں وہیں ایک پلیا پر بیٹھ گئے۔ اس کے آگے آٹو نہیں جاتا۔ بمبئی میں ٹیکسی کرنی پڑے گی۔

''چلو دادر تک اور دیکھ آئیں۔'' ظفر نے امید بندھائی۔

''آپ سوچ لیں ایسا نہ ہو کہ قربانی بھی اکارت جائے۔ اب وقت زیادہ نہیں بچا ہے۔'' عایشہ نے اندیشہ ظاہر کیا۔

اس اندیشے کے طائر اس کے کانوں کے پاس بھی پھڑ پھڑائے تھے مگر اس نے ہمت بندھائی۔

''تم فکر مت کرو عایشہ۔ دونوں کام وقت سے ہوجائیں گے''۔

اس نے شوہروں والے سرپرستانہ انداز میں تسلی دی۔

شیواجی پارک کے آس پاس اکثر بیسیوں لڑکے نظر آتے تھے مگر آج سب غائب تھے۔

آگے بڑھے تو پریل کے بعد لال باغ میں بوٹ پالش کرتا ایک لڑکا نظر آیا۔ اس سے معاملت کی بات کی تو اس نے ہنس کر بتایا کہ وہ ایک دن میں اسی روپئے کماتا ہے۔ ظفر نے جلدی جلدی حساب لگا کر اس کی ماہانہ آمدنی کا موازنہ اپنی تنخواہ سے کیا اور گھبرا کر عایشہ

کا ہاتھ پکڑ کر آگے ہولیا۔

بھارت ماتا والی سڑک سے ورلی پہنچے وہاں میلہ ہوٹل کے پاس ایک سرخ بتی پر جب ٹیکسی رکی تو ایک ۱۳— ۱۴ برس کے سیاہ فام لڑکے نے ٹیکسی کا شیشہ ایک میلے کپڑے سے اور گندہ کیا اور ان دونوں کے سامنے آکر ہاتھ پھیلا دیے۔

"کام کرو گے؟ گھر کا"۔ عایشہ نے شیشہ کھول کر بے تابی سے پوچھا۔

"کروں گا"۔

"کیا کہا؟" عایشہ اور ظفر دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"کروں گا۔ کیا ملے گا؟"

"تین وقت کا کھانا، صاف کپڑے، بجلی کا پنکھا، بستر بھی ملے گا اور ساتھ میں پیسے بھی۔ پہلے کہیں کام کیا ہے؟ عایشہ نے جلدی جلدی جملے ادا کیے۔

"ہاں پیچھو والی بلڈنگ میں گیارہ مالے پر برتن مانجھے"۔

بتی ہری ہوگئی تھی۔ دونوں جلدی جلدی ٹیکسی سے اترے، پیسے ادا کیے اور لڑکے کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے تھامے فٹ پاتھ پر آئے۔ دونوں کے دل باغ باغ تھے۔

لڑکے کا گھر اس تنگ گلی میں تھا جس کی ابتدا سڑک سے ہوتی تھی اور انتہا اس جھگی پر جاکر ہوتی تھی جو لگ بھگ آدھی کے قریب سمندر کی کیچڑ کے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ وہ جنوبی ہند کی ایک مزدور پیشہ عورت کا چوتھا بیٹا تھا جس کی ماں ابھی دو سال پہلے ایک شرابی کی جھگی میں بیٹھی تھی۔

"پیسہ —؟ ماں کے شرابی مرد نے ہاتھ نچا کر پوچھا۔

ظفر نے گھڑی دیکھی چار بج رہے تھے۔ عایشہ نے بھی وقت دیکھ لیا ظفر نے معاملت کی باتیں جلدی جلدی طے کیں اور اپنا پتہ اور سو روپئے کا نوٹ دے کر لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر، ماں اور اسکے مرد کو دلاسے دیتے ہوئے تیزی سے گلی کے باہر آئے اور ایک ٹیکسی رکوا کر تینوں سوار ہوئے۔ ماں گلی کے موڑ تک لڑکے کو چھوڑنے آئی تھی۔ وہ اپنی زبان میں لڑکے کو کچھ سمجھاتی جارہی تھی۔ لڑکا سر ہلا ہلا کر تمام باتوں کا اقرار کرتا جارہا تھا۔

ورلی سے گورے گاؤں تک ظفر نے لڑکے کا جائزہ لے کر پورا منصوبہ بنالیا کہ کس طرح اسے دو گھنٹے کے اندر اندر اس قابل بنایا جاسکتا ہے کہ صاحب اور میڈم کے سامنے پیش کرتے وقت شرمندگی نہ ہو۔ وہ اسے کچھ سمجھاتا بھی جارہا تھا۔ ورلی سے گورے گاؤں تک عایشہ نئے ملنے والے مکان کے دروازوں اور کھڑکیوں پر پردے ٹانگتی رہی اور نئے بیڈروم کی چادر کی سلوٹوں کو دور کرتی رہی۔

ورلی سے گورے گاؤں تک لڑکا ہونقوں کی طرح بیٹھا سوچتا رہا کہ تین وقت کھانا کھانے میں کتنا مزہ آئے گا۔

اپنی بلڈنگ میں پہنچ کر، دوسرے مالے پر بنے باتھ روم میں جاکر ظفر نے اسے پہلے رن صابن سے صاف کیا اور پھر لائف بوائے سے نہلایا۔ نیل کٹر سے ناخن تراشے اور ناخنوں کا میل اچھی طرح صاف کیا جو ناخن ترشنے کے باوجود انگلیوں کے سروں پر ویسا کا ویسا ہی جما رہ گیا تھا۔ اپنے بیٹے کے کپڑے پہنائے۔ پھر عایشہ نے اس کے بالوں میں تیل ڈال کر کنگھی کی۔ اب وہ بالکل تیار تھا۔ اوپر سے دونوں بچے بکرے کو لے کر نیچے اترے۔

''پاپا پاپا ہم نے اسے آج خوب روٹی کھلائی اور خوب نہلایا اور اپنی تولیہ سے صاف کیا۔'' بچوں نے داد طلب نظروں سے باپ کو دیکھا۔

''جلدی کیجئے بکرا بھی ساتھ لے جایئے۔ راستے میں ذبح کرادیجئے گا۔'' عایشہ بولی۔

''بہت کم وقت رہ گیا'' ظفر نے دیکھا کہ عایشہ کی آنکھوں میں سفید پروں اور سرخ پروں والے فرشتے پھڑ پھڑا رہے تھے۔

''تم فکر مت کرو عایشہ'' ظفر نے حسب معمول اسے دلاسہ دیا۔ اور ایک ہاتھ میں بکرے کی رسی اور دوسرے میں بچے کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیاں اتر کر نیچے آگیا۔

آٹورکشہ کے ڈرائیور کو کسی نہ کسی طرح راضی کر کے بکرے اور لڑکے کو سوار کرایا۔ گھڑی دیکھی۔ سورج ڈوبنے میں تھوڑی ہی دیر رہ گئی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔

''ذرا جلدی کرو ڈرائیور صاحب'' اسنے بے تابی کے ساتھ ڈرائیور کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب : ڈار سے بچھڑے
مصنف : سیّد محمد اشرف
ناشر : سیّد محمد اشرف
موجودہ پتہ : بی-۱، حیدر آباد اسٹیٹ، نیپئین سی روڈ، بمبئی، ۳۶۔۔۔۴۰
مستقل پتہ : خانقاہ برکاتیہ، بڑی سرکار، پوسٹ مارہرہ شریف (ایٹہ)
طبع اوّل : اُنیس سو چورانوے (۱۹۹۴ء)
قیمت : ایک سو روپے Rs.100/=
زیرِ اہتمام : انیس امروہوی
● تخلیق کار پبلیشرز، ۱۷۷۹۔ کوچہ دکھنی رائے، دریا گنج، نئی دہلی، ۲۔۔۔۱۱۰۰
سرورق : پردیپ
کمپیوٹر کمپوزنگ : شارپ کمپیوٹر پرنٹرس، لکھنؤ
مطبوعہ : سٹار آفسیٹ پرنٹرس، ۸۔۱۳۔ کلاں محل، دریا گنج، نئی دہلی، ۲۔۔۔۱۱۰۰

:ملنے کے پتے:

● ایجوکیشنل بُک ہاؤس، علی گڈھ
● نصرت پبلیشرز، لکھنؤ
● اہلووالیہ بُک ڈپو، ۴۹/۹۹۸۸۔ نیو روہتک روڈ، نئی دہلی، ۵۔۔۔۱۱۰۰
● ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی
● موڈرن پبلیشنگ ہاؤس، ۹۔ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی، ۲۔۔۔۱۱۰۰

اس کتاب کی اشاعت میں فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی، لکھنؤ، حکومت اتر پردیش کا جزوی مالی تعاون شامل ہے

T.P. : 022
DAR SE BICHHDE (SHORT STORIES)
SYED MOHAMMED ASHRAF
TAKHLEEQKAR PUBLISHERS
1779, KUCHA DAKHNI RAI,
DARYA GANJ. NEW DELHI-110002

1994
Rs. 100.00

ایک ٹوٹا ہوا آدھا سینگ جو اکثر اسے اُس جدوجہد کی یاد دلاتا ہے جو اس نے اپنے سے پہلے والے سردار کی سرکوبی میں کی تھی۔

وہ واقعہ وہ بھولا نہیں ہے۔ آج بھی اُسے اچھی طرح یاد ہے بچپن ہی سے اُسے اپنے سردار میں بہت سی خامیاں نظر آتی تھیں۔ اُس کے زخموں سے اسے گھن آتی تھی۔ سردار کی حکومت اسے پسند نہیں تھی۔ اسکی آرام طلبی سے اسے نفرت تھی۔ بغاوت کا جذبہ اس کے دل میں کھولتا رہتا اور وہ اس دن کا انتظار کرتا جب چمکتی ہوئی کالی چادر سے اس کا جسم ڈھک جائے۔ اور ایک دن وہ لمحہ آگیا۔ اسی میدان میں جب نیم کے بڑے درخت سے آگ کا گولا اوپر سرکا تھا اور ریتیلی مٹی کے ذرے خوب چمک اُٹھے تھے۔ اور اسے اپنے جسم میں بجلیاں سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں تو اسی ببول تلے بیٹھے بوڑھے سردار پر اس نے اپنی جوانی کا پہلا حوصلہ آزمایا تھا۔ پہلے تو بوڑھے سردار نے اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا، تھوڑی دیر تک وہ سمجھ ہی نہ پایا تھا کہ نوجوان اسکی سرکوبی کرنا چاہتا ہے، لیکن جب غول کے تمام ہرن ایک طرف جھنڈ بنا کر کھڑے ہوگئے۔ اور اپنی ٹانگیں زمین پر مار مار کر مٹی اڑا اڑا کر اس نئے پٹھے کی حوصلہ افزائی کرنے لگے تو وہ ایک دم تلملا کر کھڑا ہو گیا تھا، کچھ دیر تک اپنے بوڑھے بدن کے ایک ایک عضو کو ہلا ہلا کر اپنی قوت کا اندازہ کرتا رہا۔ پھر ایک بارگی اُس جوان پٹھے پر ٹوٹ پڑا۔ بہت دیر تک نئے اور پرانے کی یہ جنگ چلتی رہی۔ جب سورج بالکل ان کے سروں پر آگیا اور پرچھائیاں ان کے جسموں کے نیچے چلی گئیں تو ایک دفعہ اس نے سردار کے بوڑھے جسم سے اپنی پوری قوت کے ساتھ اپنا جوان بدن لڑا دیا۔ بوڑھا گرا، سنبھلا اور اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے سینگوں سے اسکا ایک سینگ توڑ دیا۔

اپنے جوان سینگ کا یہ حال دیکھ کر جیسے اس کے دماغ میں بھرے لاوے کو جوش آگیا ہو۔ غصہ کے مارے اسکی آنکھوں میں گدلا گدلا پانی سمٹ آیا اور اس نے اپنے ایک ہی سینگ سے بوڑھے سردار کی آنتیں کھینچ لیں۔ بوڑھا کچھ دیر تک وہیں کھڑا جھومتا رہا اور پھر بڑی تیزی سے مڑ کر پیٹ سے نکلی ہوئی سیاہی مائل خون میں ڈوبی آنتیں مٹی میں لتھیڑتا ہوا، دھول اڑاتا ہوا نہر کے پانی میں جا کر ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا۔ فضا میں منڈلاتے

"اپن بہت تیز چل رہا ہے صاحب۔ ایروپلین مافک۔" ظفر اس کے مزاح سے لطف اندوز نہیں ہوسکا۔ چہرہ نکال کر اونچی اونچی بلڈنگوں پر سمٹتی ہوئی پھیکی پھیکی سورج کی روشنی کو دیکھتا رہا۔

اچانک ایک اندیشے نے پر پھڑ پھڑائے۔ کہیں دیر ہوجانے کی وجہ سے صاحب اور میڈم نے کوئی دوسرا نوکر نہ رکھ لیا ہو۔ ہوسکتا ہے صاحب نے دفتر میں کسی اور سے بھی کہہ رکھا ہو۔ وہ یہ سوچ سوچ کر بدمزہ ہورہا تھا۔ وہ دیر تک یہی سوچتا رہا۔

اچانک اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ٹرافک کے شور میں پیچھے سے مغرب کی اذان کی آواز اس کے کان میں آئی ہو۔

"جوگیشوری کی طرف جوگیشوری کی طرف موڑلو۔ بکرا قربان کرنا ہے ڈرائیور صاحب"۔ ظفر چلایا۔

ڈرائیور نے اٹو کنارے کرکے بتایا۔

"جوگیشوری تو نکل گیا صاحب، اپن لوگ سانتا کروز کے پاس آگئے وہ دیکھو سامنے ایروپلین اڑا"۔

ظفر نے دیکھا رن وے پر ایک سفید پروں والا فرشتہ اس کی سمت آتے آتے ایک طرف کو مڑا اور دور آسمان کی طرف اڑ گیا۔

بکرے پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑگئی۔

"پھر بھی جوگیشوری چلو۔ اسے لے کر کہاں جائیں گے۔" ظفر نے کمزور آواز میں کہا۔

"قربانی کا وقت نکل گیا۔ اب اس جانور کے آدھے پیسے مل پائیں گے۔ جوگیشوری میں قصائی بولا۔

جب وہ آدھے پیسے لے کر اٹو میں بیٹھ کر روانہ ہوا تو اُسنے دیکھا سرخ پروں والا فرشتہ ہاتھ میں ننگی چھری لیئے بکرے کو اپنے گھر کی طرف ہانک رہا ہے۔ جس سڑک پر اٹو دوڑ رہا تھا وہ اسے بال سے زیادہ باریک اور قصائی کی چھری سے زیادہ دھار دار محسوس ہوئی۔ ایک اور خیال سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے کہ کہیں صاحب اور میڈم نے دیر ہوجانے کی وجہ سے کسی اور کالایا ہوا نوکر نہ رکھ لیا ہو۔

مرے مرے قدموں سے صاحب کے گھر کی سیڑھیاں چڑھ کر جب اس نے گھنٹی کا بٹن دبایا تو یہ دیکھ کر اس دل خوش ہوگیا کہ دروازہ کسی نوکر نے نہیں صاحب کے بیٹے نے کھولا تھا۔

"آئیے پاپا اور ممی آپ کا کتنی دیر سے انتظار کر رہے ہیں۔ ڈرائینگ روم میں ہیں۔"

صاحب کے بیٹے نے ڈرائینگ روم کی طرف اشارہ کیا۔

لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر وہ ڈرائینگ روم میں داخل ہوا۔ اس نے دیکھا کہ ڈرائینگ روم کے وسط میں ایک نور کا پیکر جلوہ گر تھا اور اس کے نزدیک ہی سفید پروں والا فرشتہ ساڑی پہنے کھڑا تھا جو آنے والوں کو شفقت کے ساتھ مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ ○○

آخری بَن باس

آخری بن باس

کانس کی جھاڑیوں کے درمیان کچے دگڑے پر یکے نے موڑ کاٹا، کالی ندی کے پل کو پار کیا اور پھر چار کوس کا راستہ اتنی تیزی سے پورا کیا کہ یکے میں بیٹھی اکلوتی سواری..... بوڑھے سادھو جیسے آدمی کے ماتھے پر درد کی لکیریں اور گہری پڑ گئیں۔

اب سامنے میدان کی سب سے بڑی ندی تھی۔ یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی۔ سورج جھک آیا تھا اور پرچھائیاں لمبی ہو گئی تھیں۔ اس گھڑی ندی بہت ڈراؤنی لگ رہی تھی۔

یکے سے اتر کر بوڑھے نے ایک جھرجھری سی لی۔ بدن کو چادر سے اچھی طرح لپیٹا اور گھاٹ پر بنے مندروں کے درمیان تنگ راستے پر تیز تیز چلتا ہوا اتنی دور نکل آیا کہ مندروں کی شام کی گھنٹیاں کانوں میں دھوکا بن گئیں۔ ٹخنوں تک اونچے گیہوں کے کھیتوں کو پار کر کے وہ ایک چھوٹے سے ٹیلے کے پاس آکر رک گیا۔ بستی بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ ڈوبتے سورج کی روشنی میں اس چھوٹی سی کٹیا پر کھلے گڑہل کے پھول رنگ بدل کر نارنجی ہو گئے تھے۔

کٹیا کے چھوٹے سے دروازے کے پاس جا کر بوڑھے نے بغل میں دبی پرانی پوتھی کو اچھی طرح سنبھالا اور انگوچھے سے پاؤں کی دھول کو صاف کرنے کی کوشش کی جو اوس میں مل کر گاڑھی ہو گئی تھی۔

"بابا" اس نے دھیمے سے پکارا۔ کٹیا کے باہر کہرا تھا اور اندر دھندلکا۔

"بھیتر آجاؤ" موت کی طرح خاموش اور اندھیری اس کٹیا میں اِن دو بولوں نے اجالا کیا۔

"اجالا کرو مہاراج۔ اندر بہت اندھیارا ہے۔" بوڑھے نے کہا اور سوچا اس سے میرے چہرے پر کون سے بھاؤ ہیں۔ ڈر یا شردھا۔

"اجالا اپنے من میں کرو میرے لال۔" اندر سے وہی لَو دیتی ہوئی آواز پھر ابھری۔ اب

اس نے اندھیرے میں کٹیا کے اندر پہلا قدم رکھا۔ جب آنکھیں اندھیرے کو جاننے لگیں تو سب سے پہلے اسے جس چیز کا گیان ہوا وہ اپنے ہی دل کی دھڑکن تھی۔

وہ کٹیا کی دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھے تھے۔

بوڑھے نے تھر تھراتے ہوئے قدموں سے خود کو ان کے پاس کیا اور ٹٹول ٹٹول کر ان کے پیروں کو اپنے ہاتھوں میں لے ان پر اپنا سر رکھ دیا۔ پیروں کی سوکھی کھال جب بوڑھے کی آنکھوں کے پانی سے خوب بھیگ گئی تب انھوں نے بوڑھے کی جٹاؤں پر آشیرواد کا ہاتھ رکھا۔

"دیا جلالو۔" انھوں نے ایک طرف اشارہ کیا۔

بوڑھے نے دیا جلا کر ان کے پاس رکھا اور اس کی روشنی میں پہلی بار ان کا چہرہ غور سے دیکھا۔ لمبی لمبی سفید پلکوں میں گھری ان کی آنکھیں کتنی شانت ہیں۔ لگتا ہی نہیں کہ باقی بدن کا پنجر ان ہی آنکھوں سے جڑا شریر ہے۔

"برج سے کب چلے۔" روشنی پھر ابھری۔

"آج سویرے۔ سورج سے پہلے۔" بوڑھے نے آہستہ سے کہا۔

"انتم درشن کو آئے ہو؟" آواز کی لو ابھر کر ڈوبی۔

بوڑھے نے "ہاں" میں سر ہلایا۔ آنکھوں سے پانی کی بہت سے بوندیں سفید داڑھی سے اتر کر گرم چادر میں کھو گئیں۔

"کیسے پتہ چلا کہ ہم اب جانے والے ہیں؟"

"پُرکھوں کی پوتھی میں آپ نے یہی لکھوایا تھا کہ جب آپ سے انھوں نے پوچھا کہ اتنی شردھا کے بدلے میں کیا اُپہار لو گے؟ تو آپ چپ رہے۔ انھوں نے کہا دھرتی کی سب سے مول وان چیز؟ تب بھی آپ چپ رہے۔ تب انھوں نے کہا لمبا جیون؟ تب آپ نے کہا نہیں، مریادا۔ انھوں نے جواب دیا وہ تو سب ہماری ہے۔ آپ نے کہا جیون بھی تو آپ ہی کا ہے۔ تب انہوں نے آشیرواد دیا کہ جاؤ لمبے جیون کا اُپہار تب تک تمہارے ساتھ ہے جب تک دھرتی پر ہماری مریادا ہے۔ یا انھوں نے یہ کہا کہ جاؤ، مریادا تب تک

تمہارے ساتھ ہے جب تک دھرتی پر یہ جیون ہے۔ اتنا کہہ کر وہ چلے گئے اور آپ اس ندی کے کنارے پر آکر بس گئے جہاں آپ نے جنم لیا تھا۔ آپ نے لوگوں سے اپنا بھید چھپانا چاہا تو آپ جیسی ایک دیہہ کو بنارس میں مِرتیو پراپت ہوئی۔

"اس بات کو کتنے لوگ جانتے ہیں؟"

"پریوار کا سب سے بڑا جسے پوتھی ملتی ہے۔"

"وہ کون ہے؟"

"میں ہی تو ہوں۔" بوڑھے نے پھر ان کے پیروں پر اپنا سر رکھ دیا۔ لمبی پلکوں نے آنکھوں کو بند کیا اور دھیمے سے پوچھا۔

"تم نے یہ نہیں بتایا کہ یہ کیسے پتہ چلا کہ اب جانے کا سمے آگیا؟"

"پوتھی میں ساری نشانیاں لکھی ہیں۔" بوڑھے نے پوتھی کی طرف اشارہ کیا۔

"اب کچھ چاہتے ہو؟"

"ہاں" بوڑھے نے قدموں پہ سے سر اٹھایا۔ انتم سمے میں آپ کے پاس رہنا چاہتا ہوں۔ پوتھی میں لکھا ہے کہ انتم سمے میں آپ کو درشن دیا جائے گا۔ آپ کے ساتھ ہوں گا تو درشن کی ایک جھلک مجھے بھی مِل جائے گی اور اس دھرتی پر سورگ کا آنند مِل جائے گا۔"

"پوتھی میں اور کیا کیا لکھوایا تھا ہم نے۔ لگ بھگ پانچ سو برس ہو گئے اب تو ہم بھی بھولنے لگے ہیں۔"

تب بوڑھے نے ان کے پیروں پر سر رکھ کر روتے روتے اس ندی کا نام بتایا جس کے کنارے انھوں نے آخری سانس لینا لکھایا تھا۔

تب بڑی بڑی زندہ آنکھوں اور ہڈیوں کی مالا جیسے شریر والی اس آتما نے ہلکے سے دکھ کے سُور میں کہا۔

"ہم تو لمبے جیون کا پہار لئے، خود کو بھید بنائے اس کنیا میں شتابدیوں سے براجمان ہیں۔ اس ندی تک جانے کا کیا راستہ ہے تم جانو۔"

"میں آپ کو وہاں لے جانے کا پورا پربندھ کر کے نکلا ہوں۔ آج ہی چلنا ہے۔"

"چلو۔" انھوں نے دھیرج اور گمبھیرتا سے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ تب بوڑھے نے دیکھا کہ ان کے بدن پر پسلیاں اتنی آسانی سے دکھائی دے رہی ہیں جیسے کسی مہاکاویہ کی پنکتیاں۔

ایک رات اور ایک دن کی یاترا کے بعد جب وہ اس ندی کے کنارے پہنچے تو شام ہوچکی تھی۔ ندی سے کچھ دور بستی میں بڑا شور تھا۔

"اتنے پاس آگئے ہیں۔ اندر چلیں؟" بوڑھے نے ان سے پوچھا۔

"انتم سمے ندی کنارے لکھا ہے۔ اندر جا کر کیا کرنا ہے۔" انھوں نے دھیمے سے جواب دیا۔

"میں اکیلا ہو کر آؤں؟" بوڑھے نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"جاؤ۔" انھوں نے ندی کے بہاؤ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

بوڑھا چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد لوٹ آیا۔ "بستی میں اندر جانے سے منع کر رہے ہیں۔"

"کون؟"

"سپاہی ہیں۔"

"کیوں؟"

"کہتے ہیں اندر بہت جمگھٹا ہے، تم دب جاؤ گے۔"

"پھر؟"

"وہ ندی کنارے ٹھہرنے کو بھی منع کر رہے ہیں ان کو یہی آدیش ہیں۔"

"اندر اتنا شور کیوں ہے؟"

تب بوڑھے نے دور کھڑے سپاہیوں کے ہیولوں کو دیکھتے ہوئے سرگوشیوں میں کچھ بتایا۔ سب کچھ سن کر وہ چپ ہو گئے۔ بوڑھے نے دیکھا ان کی آنکھوں کی جوت ماند پڑنے لگی تھی۔

"پوتھی میں اور کیا کیا لکھا تھا؟"

"اتنے بھاگ کی دھرتی سے جس جس کی چاہ ہوگی ان تمام آتماؤں کو اس دن ساکار

ہو کر یہاں آنے کی راہ ہوگی۔"

"نہیں، یہ بتاؤ آنے والے کل کے بارے میں کیا لکھا ہے؟"

"اس وشے میں کچھ بھی نہیں لکھا ہے کہ اُس دن ہوگا کیا۔"

"مجھے یاد آگیا وہیں میرا گیان تھک گیا تھا۔ میں ہانپنے لگا تھا۔ میں نے تمھارے پرکھے سے کہا تھا جتنا لکھا دیا بہت جانو۔ میں بھگوان نہیں کہ ہر بات کو جان سکوں۔"

"آپ کے یہ شبد پوتھی کے انت میں لکھے ہیں۔" بوڑھے نے انھیں بتایا۔

"انتم سانس کا سے؟" انھوں نے پلکیں اُٹھائیں۔

"پوتھی میں لکھا تھا کہ اس گھڑی سورج آکاش کے بیچ میں ہوگا۔"

انھوں نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ بوڑھے نے ان سے کھانے کو پوچھا۔

"نہ" میں جواب ملا۔ بوڑھے نے ان کی آگیا لے کر پوٹلی کھول کر کھانا کھایا۔ کھانا کھا کر پوٹلی باندھی ہی تھی کہ پیچھے سے بھاری بھاری قدم رکھتے، خاکی وردی پہنے ہاتھوں میں لمبے لمبے ہتھیار سنبھالے کچھ سپاہی آگئے۔

"تم بابا لوگ یہاں کیا کر رہے ہو۔ تمھارے ارادے کیا ہیں؟"

دونوں چپ رہے۔ تب ان سپاہیوں نے بوڑھے کی پوٹلی کو شک کی نگاہوں سے دیکھا اور جھپٹ کر اسے کھول لیا۔ اندر خشک روٹی اور اچار کی پھانک دیکھ کر انھیں بہت نراشا ہوئی۔

انھوں نے لیٹے لیٹے بڑی بڑی آنکھیں کھول کر سپاہیوں کو دیکھا۔ جس سپاہی نے پوٹلی کھولی تھی وہ ان نگاہوں کی تاب نہیں لا پایا۔ بولا۔

"بابا، ہم بے بس ہیں۔ بستی کے بھیتر ہمارا اس سے کوئی زور نہیں ہے اسی لیے ہم لوگ سیما پر پہرہ دے رہے ہیں۔ اس سے سیما پر ندی کنارے کوئی نہیں، آپ کے سوا۔ اس لیے شک ہوتا ہے کہ آپ لوگ کوئی اور گڑبڑ تو نہیں کر رہے ہیں۔"

"کوئی چنتا نہ کرو بالک۔ ہم یہاں انتم سے کی راہ دیکھ رہے ہیں۔" وہ دھیمے سے بولے۔

پھر بوڑھے نے سپاہیوں کو کچھ بتایا اور کچھ چھپایا۔ سپاہی سن کر ہنسنے لگے۔ بوڑھے

نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ انھوں نے لیٹے لیٹے بوڑھے کا ہاتھ دبا کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ تب سپاہی بولے۔

"دیکھو بابا لوگو۔ بستی کے بھیتر بہت ہاہاکار ہے، ہم اسی کو نہیں سنبھال پا رہے ہیں۔ اب یہاں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ لوگ درشن کرنے کا پکا پربندھ کرنے اندر جمع ہوئے ہیں اور تم یہاں ندی کنارے، بستی کی سیما سے باہر بیٹھے درشن کی راہ دیکھ رہے ہو۔ کیسی بے ڈھب باتیں کرتے ہو۔ ہم نے بھی پورا مہاکاویہ پڑھا ہے اور تم کہتے ہو کہ یہ ابھی تک جیوت ہیں۔ کیا ٹھٹھول کرتے ہو۔ پگ ڈنڈی سے ہٹ کر ندی کنارے ہو جاؤ اندھیرے میں کوئی گولی پھولی مار دے گا۔ سمجھے؟"

اچانک ایک طرف سے سینی کی زور دار آواز آئی اور وہ سب کے سب انھیں وہیں چھوڑ کر اسی سمت بھاگ لیے۔

"آپ اتنی اچھی کویتا کیسے لکھ لیتے تھے؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"شردّھا لکھواتی تھی۔" انھوں نے چھوٹا سا جواب دیا۔

کچھ دیر بعد بوڑھے نے پوچھا۔

"نین بنا انھوں نے کیسے ساری لیلائیں دیکھ لی تھیں اور کیسے ان سب کو کویتا میں ڈھال لیا تھا؟"

"اتھاہ پریم نے ان کے من کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ ان کی شردھا بھی اپار تھی اسی شردھا نے جو دیکھا اسے کویتا میں ڈھال دیا۔ اور پھر ان کی جو بھاشا تھی وہی تمھاری بھاشا ہے۔ برج کے ہو نا۔ ہمارے بول تو تمھیں کڑے لگتے ہوں گے؟" انھوں نے مسکرا کر پوچھا۔

"نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔" بوڑھے نے ان کے چرنوں کو چھو کر کہا۔

"ہمیں سہارا دے کر ندی کے کنارے لے چلو۔" انھوں نے کہا۔

بوڑھے نے انھیں جب ندی کے کنارے لے جا کر لٹایا تو شیت رُت کے آکاش پر کٹا پھٹا چاند سامنے آچکا تھا۔

"آج کی رات بہت کٹھن ہے۔" انھوں نے کمزور آواز میں کہا۔

"اور کل کا دن؟" بوڑھے نے چاند کے پھیکے اجالے میں ان کے چہرے پر موت تلاش کی۔

"کل کا دن کٹھن بھی ہے اور سُکھ بھی۔" اُن کی بڑی بڑی آنکھیں کھلیں تو بوڑھے نے دیکھا کہ ان میں کچھ کچھ آشا تھی اور کچھ کچھ نراشا۔

"اُن کے درشن سے ڈرو گے تو نہیں؟ آتماؤں کو ساکار دیکھ کر گھبراؤ گے تو نہیں؟" انھوں نے آنکھیں بند کر کے پوچھا۔

بوڑھا کچھ دیر چپ چاپ سوچتا رہا پھر بولا۔

"آپ کے ساتھ ہوں تو ڈر نہیں لگے گا۔" پھر کچھ دیر بعد بولا۔

"پوتھی میں لکھا تھا کچھ اور آتمائیں بھی ساکار ہوں گی۔ آپ سب کو پہچانتے ہیں؟"

"نہیں، سب کو نہیں۔ ہمیں اور آتماؤں سے کیا لینا میرے لال۔ پرارتھنا کرو جب ان کے درشن ہوں تو ان کے چہرے پر وہی مسکان ہو جو لمبے جیون اور مریدا کا آشیرواد دیتے سمے ان کے ہونٹوں پہ تھی۔"

"میں انھیں پہچان کیسے پاؤں گا؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"آپ ہی آپ جان جاؤ گے۔ ان کے مکھ پر چندرما جیسا ہار ہوگا۔ اب پرارتھنا کرو۔"

اچانک بستی میں بہت زور کا شور اٹھا۔ گھنٹوں کی آوازیں آنے لگیں۔

وہ ندی کنارے لیٹے جاپ کرتے رہے۔ بوڑھا آنکھیں بند کیے بیٹھا پرارتھنا کرتا رہا۔ پگ ڈنڈی کے پاس سیمل پر کھڑے درختوں پر پنچھی ویاکل ہوئے اور اُڑ اُڑ کر ندی پار جانے لگے۔

"اتنی رات کو پنچھی کہاں جا رہے ہیں؟" انھوں نے جاپ روک کر پوچھا۔

بوڑھے نے پرارتھنا توڑ کر آکاش کی طرف دیکھا۔

"فاختائیں ہیں۔ بستی چھوڑ کر ندی پار کہیں جا رہی ہیں۔"

وہ دونوں بہت دیر تک چپ رہے۔

ہوئے گدھ ایک دم کلکلا کر چیخے تھے، شور مچاتے ہوئے بہت سے پرندے ان کے سروں پر سے گزر گئے تھے اور وہ خود فتح کے نشے اور لڑائی کی تھکن میں چور وہیں بیٹھا بہت دیر تک تھر تھراتا رہا اور پھر ایک دم سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اب وہ اپنے غول کا سردار تھا۔ نئی اور پرانی مادائیں اسے چاروں طرف سے گھیرے کھڑی تھیں اور وہیں ایک چھوٹا سا بچہ اپنی معصوم لیکن چمکدار آنکھوں سے اس کے خون میں ڈوبے ہوئے جوان بدن کو دیکھتا اور کبھی اس دھول کی طرف جو بوڑھے سردار کے آخری قدموں سے اڑی تھی اور اب تک فضا میں منڈلا رہی تھی۔

سورج آسمان میں اپنا چکر پورا کر رہا تھا۔ اور آج بوڑھے سردار کو ایک ایک بات یاد آ رہی ہے۔ کچھ دنوں سے وہ اسی بچے کی آنکھوں میں گیہوں کٹ جانے کے بعد والے سورج کی چمک محسوس کر رہا ہے۔ وہی سورج کی چمک جو ہرنوں کے رنگ کو مزید سیاہ کر دیتی ہے، وہی چمک جو گیہوں کی ہری بالوں میں سنہرا دانہ سجا دیتی ہے۔

اس نے تھکن سے بوجھل آنکھیں اٹھا کر کالو کو دیکھا۔ سیاہ بالکل سیاہ بدن والا کالو۔ ابھی سورج نیم کے درخت کے پیچھے ہے۔ جب اوپر آئے گا تو سیاہ روغنا اور زیادہ چمک اٹھے گا۔

اور کالو سب سے پرے کھڑا اپنی ٹانگیں زمین پر مار رہا ہے۔ اسکا دل بے ساختہ چاہ رہا ہے کہ بوڑھے سردار، پرانی ماداؤں اور بقیہ ہرنوں سے الگ کھڑی، سنہری، کے پاس جا کر اسے اپنی زبان سے چاٹے، اسکی چھوٹی سی تھوتھنی کو سونگھے اور اس کے جسم پہ نکیلے سینگ ہولے سے چبھودے۔ لیکن وہ جب بھی یہ ارادہ کرتا اسے بوڑھے سردار کی آنکھیں سرخ نظر آنے لگتیں اور وہ اپنا ارادہ کچھ دنوں کے لئے ترک کر دیتا۔ بڑی بڑی کالی آنکھوں والی سنہری اپنے بدن کو کچھ اس انداز سے حرکت دے رہی تھی کہ اسکا دل بے ساختہ چاہا کہ اس کے پاس چلا ہی جائے۔ آج اس کا دل یہ بھی چاہ رہا تھا کہ بوڑھے سردار کو سینگ مار مار کر لہولہان کر دے اور اس کا اکلوتا سینگ بھی توڑ دے اور پھر سنہری کے پاس جا کر اپنا منہ سنہری کی تھوتھنی سے رگڑ دے۔ لیکن سردار کی موجودگی میں یہ سب کچھ کرنا بہت

زبردست شور کی آوازوں سے پتہ چلا کہ سویرا ہو گیا۔ وہی سپاہی ان کی طرف بھاگتے چلے آرہے تھے۔

"بابا تم لوگ گئے نہیں؟ بستی کے باہر تو کم سے کم مت نظر آؤ۔"

"اب سمے بہت کم رہ گیا ہے۔ ہمیں یہیں رہنے دو۔" بوڑھے نے بھیک مانگنے والی آواز میں کہا۔

"نہیں سب کے سامنے نہیں۔ تم دونوں ندی کے پانی میں اتر کر کھڑے ہو جاؤ۔ وہیں سے دیکھتے رہنا۔ باہر ہو گے تو جان کا خطرہ ہے۔ تمھیں کل ہی بستی کے اندر چلے جانا چاہیے تھا۔"

وہ دونوں برف جیسے پانی میں اتر کر کھڑے ہو گئے اور بستی کی سیما پر آنکھیں لگا دیں۔ سیما سے پرے بستی کے بھیتر بے گنتی لوگ ہاتھوں میں لمبی لمبی چیزیں اٹھائے ایک رنگ کے کپڑے پہنے ایک ایسی بھاشا میں شور اٹھا رہے تھے جو ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔

تب انھوں نے بوڑھے سے پوچھا۔

"بستی والوں کو دیکھ کر تم کیا سوچنے لگے؟"

"کچھ نہیں۔ ان کے کپڑے دیکھ کر مجھے آپ کی کنیا کے پھولوں کا رنگ یاد آ گیا۔ اس سمے وہ پھول عجیب رنگ کے ہو گئے تھے۔"

"جب سورج ڈوبنے کو ہوتا ہے اور سانجھ چھا جاتی ہے تو سارے پھولوں کے رنگ بدل جاتے ہیں میرے لال۔" انھوں نے کمزور آواز میں دھیمے دھیمے کہا۔

تبھی اچانک بوڑھے کے سر میں ایک ترشول ابھرا۔ اس نے ندی کے بہتے ہوئے پانی کو دیکھ کر ان سے پوچھا۔

"پوتھی میں لکھا تھا کہ آپ کے لمبے جیون کا اپہار تب سماپت ہو گا جب ان کی مریادا بھنگ ہو گی۔ کیا.....؟"

"اب کیا سمے ہے؟" انھوں نے بوڑھے کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔

"سورج کچھ ہی دیر بعد بیچ آکاش میں ہوگا۔" یہ کہتے ہوئے بوڑھے کے ہونٹ کانپے۔
اندر بستی میں بہت زور کا طوفان اٹھا اور کچھ عجیب عجیب آوازیں آنے لگیں۔
"یہ آوازیں کیسی ہیں؟" انھوں نے ندی میں کھڑے کھڑے آنکھیں بند کیے، کمزور آواز میں اٹکتے ہوئے پوچھا۔
بوڑھے نے دھیان سے سنا اور بتایا۔
"جیسے اینٹ گارا اگر رہا ہو۔"
"اب میرے بھیتر بھی اینٹ گارا اگر رہا ہے۔" انھوں نے مشکل سے آنکھیں کھولیں اور اپنے اندر کا پتہ دیا۔
"کیا سمے ہو گیا۔" اس بار بوڑھے نے ڈر اور آشا کے سُوَر میں پوچھا۔ وہ چپ رہے لیکن آنکھیں کھلی رکھیں۔
ندی چپ تھی، آکاش چپ تھا اور سامنے لیٹی پگ ڈنڈی چپ تھی۔ بستی کی سیما پر کھڑے درختوں کے سارے پنچھی کہیں اور جا چکے تھے۔
بستی سے اینٹ اور گارا اگرنے کی آواز بہت زور سے آئی۔ بوڑھے نے چونک کر ان کے شریر کو دیکھنے کی چاہ کی جو گردن تک پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔
انھوں نے ایک پھیکی مگر شانت مسکراہٹ کے ساتھ بوڑھے کو دیکھا۔ یکایک بستی کی سیما پر کھڑی جھاڑیوں میں بہت سے قدموں کی گھبرائی ہوئی چاپیں سنائی دیں۔ گھبرائے ہوئے مگر گمبھیر چہرے لیے بہت سے لوگ روتے بلکتے جھاڑیوں کو پھلانگتے سیما سے باہر نکل رہے تھے۔ ان سب کے چہرے سنہرے تھے یا روپہلے تھے۔
ان میں ایک آدمی سفید اچکن پہنے تھا جس کے دل کی جگہ خون کا بڑا سا تازہ نشان تھا۔
"یہ کون ہے؟" انھوں نے جاتی ہوئی آواز میں بوڑھے سے پوچھا۔
بوڑھے نے دھیان سے دیکھا اور پہچان کر بتایا کہ پہلے رکت کے اس نشان کی جگہ کوئی اور چیز ہوتی تھی جو اس سمے یاد نہیں آ رہی۔
جھاڑیوں میں پھر آواز آئی۔ اس بار ایک بوڑھا آدمی آدھے کپڑے پہنے ہاتھ میں کچھ

لیے ہوئے نکلا۔ انھوں نے مشکل سے آنکھیں کھولیں اور پوچھا۔

"کیا اس کے ہاتھ میں مرا ہوا سانپ ہے؟"

بوڑھے نے اس کمر جھکے آدمی کو بستی سے نکل کر دور بھاگتے ہوئے دیکھا اور بتایا۔

"نہیں، اس کے ہاتھ میں جو کچھ بھی ہے وہ ہل رہا ہے۔ وہ جیوت سانپ ہے یا ہو سکتا وہ سہارے کی لکڑی ہو۔ وہ ہمیشہ ایسی ہی لکڑی لے کر چلتے تھے۔"

آخری بار بستی کی سیما پہ کھڑی جھاڑیوں میں ایسی آواز ہوئی جیسے اندر والے بہت بے تابی سے بستی سے باہر نکلنا چاہتے ہوں۔ وہ تین لوگ تھے، دو خوب صورت جوان مرد اور ایک حسین عورت۔ وہ دیوانوں کی طرح گھبرائے ہوئے بستی سے باہر نکل کر آ رہے تھے۔

"یہ کون ہیں؟" بوڑھے نے ان کی طرف دیکھا جو اپنی پوری آنکھیں کھولے ان تینوں کو دیکھ رہے تھے۔

اور تب برہما منڈ پر ایک سناٹا سا چھا گیا۔ اسی پل ندی نے ایک لمحے کیلئے اپنا بہاؤ روکا اور انھوں نے شیر دھا، خوف، نراشا اور شانتی کے ساتھ اپنے شریر کو ندی کے بہاؤ میں ڈوبنے کے لیے چھوڑ دیا۔

بوڑھا ان تینوں کو قریب سے دیکھنے کے لیے ندی سے باہر آیا۔ دونوں مردوں اور حسین عورت کے بدن پر لباس تار تار تھے۔ ہاتھوں پر پتھروں کی چوٹ سے خون کے کھرنڈ جم کر تلک بن گئے تھے۔ سر کے تاج ٹوٹ کر آنکھوں پہ ڈھلک آئے تھے اور ان تینوں کے سروں کے گرد چاند کی طرح ہالے تھے۔

بوڑھے نے سر جھکا کر دونوں ہاتھ جوڑ کر انھیں پرنام کیا، ہاتھ میں دبی اتہاس کی پوتھی کا ایک ایک پنّا چاک کیا اور وہیں دھرتی پہ گر کے ندی کنارے کی دھول میں اپنا چہرہ اور پورا بدن خاک کیا۔

○○

روگ

روگ

سورج ڈوبے دیر ہو چکی تھی یا شاید ابھی ابھی ڈوبا تھا کہ سڑک کے داہنی طرف گھوم کر جنگل جانے والے ڈھلان دار راستے پر ویگن آہستہ سے اتری اور پورا موڑ کاٹ کر ابھی انجن نے رفتار بھی نہیں پکڑی تھی کہ گاڑی کی پلیا کے پاس اوور کوٹ پہنے کھڑی اس عورت نے ہاتھ سے گاڑی روکنے کا اشارہ کیا جس کے دوسرے ہاتھ میں ایک نو عمر لڑکے کا سیدھا ہاتھ تھا۔

اضطراری طور پر ندیم نے بریک لگائے۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی اور اس حصے میں اتنی دھول اُڑی کہ عورت کی پنڈلیاں اور لڑکے کے گھٹنے کچھ دیر تک گرد میں چھپے رہے۔

دھول زمین پر بیٹھنے اور انجن کی گھڑگھڑاہٹ کے خاموش ہونے تک کے وقفے کے درمیان ندیم نے گاڑی کے اندر تین جملے سنے اور شرمندہ ہوا۔

ڈاکٹر وقار نے سیٹ پر رکھی رائفل ہاتھ میں لے کر کچھ تیز لہجے لیکن سمجھانے والے انداز میں کہا تھا۔

"گاڑی کاہے روک دی۔ یار ڈی۔ ایف۔ او۔ صاحب وہاں رینجری میں انتظار کرتے کرتے سوکھ گئے ہوں گے۔ ویسے ہی لیٹ ہو گئے ہیں۔"

آصف نے کھڑکی کا شیشہ کھسکا کر باہر کھڑی عورت اور بچے کو دیکھ کر پھر اندر منہ کر کے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"پاگل ہاتھی کے شکار کو چلے ہیں اور عورت کو دیکھتے ہی ہیرو بن جاتے ہیں۔"

راشد نے کچھ سوچتے ہوئے خوانخواہ تشویش والے انداز میں کہا تھا۔

"پوچھا تو جائے نیچے اُتر کر۔ کون ہے؟ کیا چاہتی ہے؟"

ندیم نے دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھولا...... باہر دسمبر کی ہوا تھی۔ وہ نیچے اُتر کر

عورت کے پاس پہنچا۔

"ارے ظالم۔ دروازہ تو بند کر جاتا۔ اب کے بڑی ٹھنڈ ہے۔ لگتا ہے پھر کہیں برف پڑ رہی ہے۔"

ڈاکٹر وقار خود سے مخاطب تھے۔

ندیم نے واپس آکر سیٹ پر بیٹھ کر دروازہ بند کیا اور مڑ کر اندر والوں کو مخاطب کرنا چاہتا ہی تھا کہ اسے کچھ دھیان آیا اس نے دروازہ پھر کھول دیا۔

راشد نے دیکھا کہ عورت کے چہرے پر دروازہ بند ہونے سے جو کھنچاؤ پیدا ہوا تھا وہ آہستہ آہستہ چھٹ گیا اور چہرہ بشاش ہو گیا۔

"اصل میں..... اس عورت کے پاس دس ہزار روپے ہیں۔" ندیم یہ کہہ کر چپ ہو گیا جیسے اسے احساس ہو گیا ہو کہ بغیر تمہید کے یہ جملہ کچھ ناموزوں سا تھا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟ کس کے روپے ہیں؟ بلکہ اتنے روپے کیوں ہیں اس عورت کے پاس..... وہ بھی جنگل کے راستے میں....."

ندیم نے ڈاکٹر وقار کی بات کاٹی اور کچھ خود اعتمادی کے انداز میں ایک ساتھ بول گیا۔

"بروالی گاؤں میں کتھے کے تاجر ہیں نا اگروال ان کے یہاں سے یہ روپیہ لائی ہیں۔ کینیڈا سے آئی ہوئی ہیں۔ رہنے والی لکھنؤ کی ہیں۔ اگروال کو یہ روپیہ انھوں نے کینیڈا میں ہی دیا تھا کہ جب یہ ہندستان آئیں تو وہ انھیں واپس کر دے۔ ان کو آج ہی رات تک لکھنؤ پہنچنا ہے۔ ان کے ساتھ جو بچہ ہے وہ ان کا بھانجا ہے۔ اس کا نام راجو ہے۔ آج بسوں کی اسٹرائک ہے، یہ بات ان کو گاؤں سے رخصت ہونے کے بعد معلوم ہوئی۔ واپس گاؤں جانا نہیں چاہتیں کیوں کہ پورے گاؤں میں ایک بھی گھر....."

کچھ کہتے کہتے رک گیا کہ اسے ابھی ابھی ڈاکٹر صاحب کے کمپاؤنڈر ریش کی موجودگی کا احساس ہوا تھا جو اپنی ایک نالی بندوق پکڑے سب سے پچھلی سیٹ پر خاموش بیٹھا تھا۔

کبھی کبھی پوری صورت حال ایک ساتھ سمجھ میں آجاتی ہے۔

"رینجری تک لیے چلتے ہیں وہاں سے ڈی۔ ایف۔ او صاحب کے ساتھ بہرائچ تک بھیج دیں

گے۔ بلکہ ان سے کہیں گے کہ بہرائچ کے بس اسٹینڈ تک چھوڑ دیں۔" ڈاکٹر وقار اس طرح بولے جیسے اپنی تجویز پر تائید چاہتے ہوں۔

گاڑی رکنے سے اب تک جو تناؤ پیدا ہوا تھا وہ اس جملے سے ٹوٹ گیا اور سب مطمئن نظر آنے لگے۔

ڈاکٹر وقار اپنی رائفل اٹھائے پیچھے کی سیٹ پر جا کر آصف کے ساتھ بیٹھ گئے۔

ندیم نے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ پکڑ کر دوسرے سے کھلے ہوئے دروازے کا اندرونی ہینڈل پکڑا اور چہرہ باہر نکال کر عورت کو پکارا۔

"آجائیے۔ آپ کھڑی کیوں ہیں۔ ہم لوگ اصل میں اندر جگہ کر رہے تھے۔" اس کے اس جھوٹ پر سب لوگ دل ہی دل میں مطمئن ہوئے۔

اس نے دوسری طرف کا دروازہ کھول دیا۔ عورت نے پہلے بچے کو چڑھایا اور پھر بورڈ پر جوتے رکھ کر ایک جھٹکے میں اوپر چڑھ گئی۔ وہ فل بوٹ پہنے ہوئے تھے۔ گاڑی پر چڑھنے سے لے کر سیٹ پر بیٹھنے تک کے وقفے میں سب نے اسے غور سے دیکھ لیا۔ جس وقت وہ سڑک کے کنارے ذرا دور کھڑی تھی اس وقت گردن موڑ کر اسے دیکھنا کچھ معیوب سا لگ رہا تھا۔

وہ نکلتے ہوئے قد کی ایک جوان اور دلکش عورت تھی۔ اس کے رخساروں کی کھال کے کھنچاؤ اور چہرے کی نرم نرم چمک دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ شاداب پھل کثرت سے کھاتی رہی ہے۔ ایسا صرف ندیم نے سوچا تھا۔ ممکن ہے اس سے ملتی جلتی بات اوروں نے بھی سوچی ہو۔

عورت نے اپنے اوور کوٹ کی جیب پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر کچھ محسوس کیا اور بچے کو کندھے سے پکڑ کر اپنے نزدیک لا کر بغیر چہرہ موڑے سب کو دھیمے سے "تھینک یو" کہا۔

پھر دوسرے ہی لمحے کچھ سوچ کر کہا۔ "آپ سب کا بہت بہت شکریہ۔"

سڑک کے دونوں طرف کھیت تھے۔ اب اتنا اندھیرا پھیل گیا تھا کہ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ کون سی فصل بوئی ہوئی ہے۔

سامنے سڑک پر جنگل کی چوکی کا پہرہ تھا۔
چوکی کے سامنے جا کر گاڑی دھیمی ہوئی ہی تھی کہ ملگجی وردی پہنے چوکی والے نے گاڑی کے سامنے آکر ہیڈ لائٹس کی روشنی سے آنکھوں کو بچانے کے لیے ہاتھ آگے کیا اور ٹیڑھا ٹیڑھا چہرہ کر کے گاڑی کو پہچانا اور پہرہ اونچا کر دیا۔ چوکی پار کر کے گاڑی ابھی تھوڑی ہی دور بڑھی ہوگی کہ آصف نے کہا۔

"ندیم! ایک منٹ کو روکنا ذرا..... بس تھوڑا سا۔"

"وہی حرکت..... وہی خوشبو والی بات نا؟" ڈاکٹر وقار نے پوچھا۔

"ہاں۔" آصف نے دھیرے سے جواب دیا۔

گاڑی رکی تو آصف کے ساتھ ڈاکٹر وقار بھی نیچے اترے۔ اور اس وقت جب دروازہ کھلا تھا تو باہر سے جو ہوا اندر آئی تھی وہ کسی اور سیارے کی ہوا تھی۔ گاڑی جنگل کے اندر داخل ہو چکی تھی۔

آصف اور ڈاکٹر وقار دیر تک گاڑی سے ٹیک لگائے تیز تیز سانسیں کھینچتے رہے۔ ندیم نے بھی اپنا دروازہ کھول لیا تھا۔ اس نے سامنے پھیلے جنگل کی طرف ناک کر کے تیزی سے گہری گہری سانسیں لیں اور جنگل کی خوشبو کو بہت استغراق کے ساتھ محسوس کرنے کی کوشش کی۔ اس نے سوچا اس خوشبو میں ساگون کے ہاتھی کے کان جیسے بڑے بڑے پتوں کی مہک، ساکھو کے تنے کی چھال کی تیز بو، جنگل کی طرح طرح کی گھاسوں کی مہکار اور جنگل میں بسنے والی سینکڑوں اقسام کی مخلوق کی جلد اور بالوں کی حیوانی بو شامل ہے۔ اور کیوں کہ اس وقت اندھیرا ہے اور آنکھیں اپنا کام نہیں کر پا رہی ہیں اس لیے جنگل صرف ناک کے ذریعے شامہ کے سہارے اندر ہی اندر اترتا چلا جا رہا ہے اور سامنے چاروں طرف پھیلے جنگل میں کھڑا یہ گہرا سناٹا وجود کو کبھی کبھی کیسا بے معنی اور کبھی کبھی کیسا بامعنی بنا دیتا ہے۔ اور جنگل کے اندھیرے سناٹے کو جب کسی پرندے کی خوابیدہ چہکار یا کسی چرندے کے چرنے یا بھاگنے کی آواز یا کسی درندے کی غراہٹ توڑتی ہے تو لگتا ہے اتنے حصے میں اجالا پھیل گیا ہو۔ کبھی کبھی آواز روشنی بن جاتی ہے۔

بچے نے ان سب کو پہلے بے تعلقی، پھر تعلق کے ساتھ، پھر نہایت غور سے دیکھنا شروع کیا۔

ندیم نے سوچا جیسے آواز کبھی کبھی روشنی بن جاتی ہے تو کیا روشنی بھی کبھی کبھی آواز بن سکتی ہے۔ وہ اس بے ربط بات کو کسی منطقی نتیجے تک لے جانا چاہتا تھا کہ اتنے میں ڈاکٹر وقار نے دروازہ بند کیا اور خود کو سیٹ پر گرا کر اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔

"اماں کتنا خوبصورت اور پرسکون جنگل تھا۔ اس سالے پاگل ہاتھی نے سب گڑبڑ کر دی۔"

پاگل ہاتھی کے نام پر عورت اور بچے کے بیٹھنے کے انداز میں کچھ تبدیلی آئی۔

"کتنا مزہ آتا تھا وقار بھائی جب ہم لوگ کئی کئی دن تک جنگل میں آکر رہتے تھے۔ کسی بھی طرف چلے جاؤ کوئی جو کھم نہیں۔ پچھلے موسم میں ہم لوگ چاند نی رات میں رینجری سے لے کر گیروا ندی تک پیدل پیدل گئے تھے اور وہاں ریت پر لیٹے گھڑیال دیکھے تھے۔ کتنا مزہ آیا تھا۔ راستے میں گدار بھی ملا تھا بلکہ دو گدار ملے تھے۔" راشد نے یاد دلایا۔

"اب تو سورج مندے بعد جنگل میں داخل تک نہیں ہو سکتے۔" پیچھے سے رمیش نے نکتہ لگایا۔

ندیم نے دروازہ بند کر کے گاڑی اسٹارٹ کی تو اسنے دیکھا کہ بچہ عورت سے لپٹ کر اسکے پہلو میں چھپ رہا ہے اور شاید رو رہا ہے۔

"کیا بات ہے؟" اس نے بچے سے پوچھا لیکن عورت کی طرف دیکھا۔

"یہ ہاتھی والی بات سے ڈر گیا ہے۔" اس نے بچے کو مضبوطی سے پکڑ کر اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔ "مطلب پاگل ہاتھی کا نام سن کر۔ یہ کیا معاملہ ہے۔ کیا یہاں کوئی ہاتھی روگ ہو گیا ہے۔"

"ہاں پچھلے کچھ عرصے سے جنگل میں ایک روگ ہو گیا ہے۔ ہم لوگ اسی کو مارنے جا رہے ہیں۔"

اب بچہ عورت کی کمر مضبوطی سے پکڑے مگر چہرہ گھمائے ندیم کی بات سن رہا تھا۔

رینجری تک پہنچتے پہنچتے ندیم عورت کو بتا چکا تھا کہ یہ روگ اب تک بہت سی معصوم جانیں لے چکا ہے اور یہ کہ اس روگ کا ایک دانت ٹوٹا ہوا ہے اور یہ کہ اس ہاتھی کے پیٹ پر ایک دیہاتی کی بندوق کی گولی کے زخم کا نشان ہے۔ اور یہ کہ اس ضلع کے جنگلات کے افسر نے چیف وائلڈ لائف وارڈن کے پاس رپورٹ بھیج کر اس ہاتھی کو روگ ڈکلیر کرایا ہے اور ڈاکٹر وقار اور آصف کو اس روگ کو مارنے کا اجازت نامہ ملا ہے اور یہ کہ پہلے تو اِکا دُکا واقعات ہی ہوتے تھے لیکن آہستہ آہستہ اس ہاتھی کی من مانیاں بڑھتی گئیں۔ پھر لوگوں نے احتجاج کیے، گرام سبھا سے بات بلاک کی سطح پر آئی پھر ضلع کی سطح پر، پھر صوبائی اسمبلی میں یہ معاملہ اٹھایا گیا لیکن جنگل اور جنگل کے جانوروں کا تعلق مرکزی حکومت سے بھی ہوتا ہے اس لیے مرکزی پارلیامنٹ میں بھی اس معاملے پر کئی مرتبہ زبردست بحث مباحثہ ہوا۔ عورت کے پوچھنے پر ندیم نے یہ بھی بتایا کہ شروع شروع میں اسی ہاتھی کو ختم نہ کرنے کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ اتنے ہاتھیوں میں روگ کی شناخت نہیں ہو پا رہی تھی۔ ویسے بھی سرکاری کاموں میں اکثر تاخیر ہو جاتی ہے کیوں کہ دفتری نظام کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اتنے بڑے علاقے کو....."

کیوں کہ رینجری دور تھی اور وقت کافی تھا اور عورت دلکش تھی اس لیے ندیم نے اس بات پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی کہ حکومت کے اپنے وسائل کسی حد تک محدود ہوتے ہیں، خاص طور پر اس قسم کے ہنگامی حالات میں۔ اس لیے حکومت کبھی کبھی سہولت کے پیش نظر ذاتی اداروں یا افراد سے رابطہ قائم کر کے کچھ ذمہ داریاں ان کے سپرد کر دیتی ہے۔ مثلاً اس وقت بھی ہاتھی کو مارنے کا جو اصل اجازت نامہ ہے وہ خود ڈی۔ ایف۔ او صاحب کے نام ہے مگر ڈی۔ ایف۔ او صاحب سرکاری افسر ہیں۔ زیادہ قابل اعتبار نہیں ہیں۔ تمام بڑے افسران بلکہ حکومت کے کچھ ارکان بھی اس بات سے واقف ہیں کہ دراصل اجازت نامہ ڈاکٹر وقار اور آصف بھائی کے نام ہے۔ ڈی۔ ایف۔ او صاحب کا نام تو محض خانہ پری کے واسطے ہے۔

عورت نے اس بیچ ندیم کو مخاطب کر کے لیکن سب کو مطلع کرنے والے انداز میں بتایا تھا کہ وہ پچھلے دس سال سے کینیڈا میں ہے جہاں اسکا شوہر ڈاکٹر ہے اور یہ کہ وہ ہر دو سال بعد

دشوار تھا۔ حالانکہ سردار کی عادتوں، اسکی آرام طلبی اور کاہلی سے پرانی مادائوں کے علاوہ سبھی ہرن نالاں تھے اور پرانی مادائیں بھی شاید اس لئے سردار کی خوشنودی میں لگی رہتی تھیں کہ وہ آڑے وقت میں ان کے کام آسکے۔ عمر ڈھل جانے کے بعد اور اپنی ذات کو غیر مفید سمجھ لینے کے بعد اسی قسم کے تحفظ کا جذبہ ہر جاندار کی فطری جبلت ہے۔ لیکن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود بھی سردار کی سرداری میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اب بھی سارے ہرن اسی کی قیادت میں سارے کام کرتے۔ اسی کی آنکھیں دیکھ کر ارہر کے کھیت چرتے اور اسی کے حکم سے کبھی کبھی اپنا میدان چھوڑ کر دوسرے میدانوں میں چلے جاتے۔ کچھ عجیب سا دبدبہ تھا جو ان پر ہمیشہ مسلط رہتا۔ کچھ تو اس کی طاقت کا وہ رعب ان پر سوار رہتا جو اس نے اپنے بوڑھے سردار کی سرکوبی میں ظاہر کی تھی اور کچھ اس کی بزرگی کا ادب۔

لیکن آج کالو بہت مضطرب تھا۔ بچپن کا وہ واقعہ اس کے شعور سے نکل کر لاشعور میں جا گھسا تھا جب موجودہ سردار نے اپنے سابق سردار کو ختم کیا تھا اور کالو نے اپنی معصوم نگاہوں سے وہ سارا منظر دیکھا تھا۔ اب تو اُسے صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ اسکی چمکتی ہوئی کالی جلد کے نیچے چمکتا ہوا لال خون دوڑ رہا ہے۔ اس کے سینگ ہلکا سا بل کھا کر پوری لمبائی تک پہونچ چکے ہیں اور اسے کسی بھی قیمت پر سنہری کو حاصل کرنا ہے۔

ادھر بوڑھے سردار نے سوچتے سوچتے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں نیم کے پرانے درخت کے نیچے سے آگ کا گولا اوپر سرک رہا تھا۔ قرب و جوار کی ہر شے کا رنگ آہستہ آہستہ واضح ہو کر اپنے اصلی روپ میں نکھرنے لگا۔ دور کے ارہر اور ایکھ کے کھیتوں میں اب بھی دھند کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ آج پورے غول میں اسے عجیب سی بے چینی کا احساس ہوا۔ ایسی بے چینی اور بے کلی تو اس نے کبھی دوسرے غول کے ہرنوں سے لڑنے پر بھی اپنے غول میں محسوس نہیں کی تھی۔ سارے ہرن اٹھکر کھڑے ہو گئے تھے۔ مادائیں کبھی اس کے پاس آتیں، اسے سونگھتیں اور ایک دم چونک کر تیزی سے کنوتیاں بدل کر پرے ہٹ جاتیں۔ ہرنوں کے پیروں کے نیچے سے دھول اڑ رہی تھی۔ سورج اب خوب اٹھ چکا تھا۔ سردار کے زخم اب خوب صاف نظر آنے لگے تھے۔ اس کی رانوں کی پشت پر بیٹھی مکھیاں بار

آکر لکھنؤ میں اپنے والدین سے مل لیتی ہے اور یہ کہ جب وہ پہلی مرتبہ کینیڈا گئی تھی تو اس وقت راجو صرف ایک سال کا تھا اور یہ کہ اس وقت راجو چھٹے کلاس میں پڑھتا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ لکھنؤ سے بروئی ضلع بہرائچ اکیلے بھی آسکتی تھی لیکن والدین نے اتنی دور اکیلے بھیجنا معیوب جانا اور حفاظت کے لیے اس مرد کو ساتھ کردیا۔ مرد کہتے وقت اس نے اپنے بھانجے کو محبت سے دیکھا تھا اور مسکرائی تھی۔ راجو بھی ہاتھی کے ذکر سے پیدا ہونے والے خوف کے باوجود مسکرایا تھا بلکہ شاید کچھ شرمایا بھی تھا۔ عورت نے یہ بھی بتایا کہ والدین نے بہت سختی سے تاکید کردی تھی کہ ہر حالت میں مغرب کے وقت تک واپس ہوجانا کیوں کہ اس پورے علاقے میں آج کل........"

اتنا کہہ کر اسے خاموش ہونا پڑا کیوں کہ اس کی ان باتوں کو سنتے ہی ڈاکٹر وقار زور زور سے ریش کا نام لے لے کر اس سے کوئی بے ربط سی بات کرنے لگے تھے۔

اس درمیان ریش نے اس بات کا اقرار کیا کہ جب سے ترائی کے علاقے میں سکون ختم ہوا ہے وہ بھی خوف زدہ ہے اور رات کو ہائی وے کے سفر سے بچتا ہے کیوں کہ پچھلے اتوار پہلی بھیت میں پورن پور کے پاس ایک بس روک کر........

عورت بیچ بیچ میں بچے کو دھیمے دھیمے کچھ سمجھاتی جارہی تھی۔ ندیم نے عورت کا کام ہلکا کرنے کے لیے راجو کو اپنے اعتماد میں لینے کی کوشش کی اور اس بات کو محسوس کرکے خوش ہوا کہ راجو جیسے جیسے اس کے اعتماد میں آتا جارہا ہے وہ عورت خوش اور مطمئن ہوتی جارہی ہے۔ یہ سوچ کر ندیم اور زیادہ جوش وخروش سے بچے کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔

اس نے بچے کو بتایا۔

"اس خطرناک ہاتھی کو مارنے کے لیے کئی رائفلوں کی ضرورت بھی پڑسکتی ہے۔"

"آپ کے پاس کے رائفلیں ہیں؟"

"ایک رائفل ہے مگر دو بندوقیں بھی ہیں لیکن بندوق کے کارتوس کا ہاتھی پر زیادہ اثر نہیں ہوتا۔ اس کے لیے بڑے بور کا رائفل چاہئے۔"

"رائفل الگ الگ طرح کے ہوتے ہیں؟" بچے نے پوچھا تھا۔

"ہاں۔ رائفل کی گولی کے وزن اور رفتار کے حساب سے رائفل کی الگ الگ قسمیں ہوتی ہیں جیسے تھرٹی اسپرنگ فیلڈ، تین سو پندرہ، کاربائن۔"

راشد نے پیچھے بیٹھے بیٹھے محسوس کیا کہ ندیم باتیں تو بچے سے کر رہا ہے لیکن سنا رہا ہے عورت کو۔ شاید اپنی معلومات کا رعب ڈال رہا ہے۔

ندیم بتا رہا تھا۔

"ہمارے پاس جو رائفل ہاتھی کو مارنے کے واسطے ہے وہ ہے تین سو پچھتر میگنم۔ اس کی گولی کے وزن اور رفتار کے تناسب کا دنیا میں کوئی جواب نہیں ہے۔"

"تناسب کیا؟" بچے نے پوچھا تھا۔

"تناسب..... تناسب یعنی کہ ریشو۔"

"ریشو تو ارتھ میٹکس میں ہوتا ہے۔" بچہ بولا تھا۔

"وہی والا ریشو اور چیزوں میں بھی ہوتا ہے بھائی۔" ندیم سمجھانے میں ناکام ہوا تو جھنجھلانے لگا۔

"اور اگر جیسے رائفل ہاتھی پر چلائیں اور اسی وقت رائفل خراب ہو جائے تو؟....." بچے نے سوال کیا۔

"شبھ شبھ بولو یار۔" آصف نے مداخلت کی۔

"ایسے موقع پر ہم لوگ بندوق سے فائر کر کے ہاتھی کو بھگا سکتے ہیں۔"

ندیم نے بتایا۔

"اگر وہ نہ بھاگے تو؟"

"تو بہت سی آگ جلا کر اسے دفان کر سکتے ہیں۔"

"وہ آگ سے ڈرتا ہے؟" بچے نے پوچھا۔

"وہ رات میں روشنی سے ڈرتا ہے۔" ندیم کے بجائے راشد نے جواب دیا تھا۔

"آپ کے پاس آگ کے لیے کچھ ہے۔" بچے نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ یہ موجود ہے۔" ڈاکٹر وقار نے مسکراتے ہوئے ماچس دکھائی اور سگریٹ

نکال کر سلگائی۔

یہ جواب سن کر راجو دیر تک ماچس کو دیکھتا رہا۔

باتوں باتوں میں عورت نے ندیم کو یہ بھی بتایا کہ لکھنؤ میں اس کے والدین نے یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ یہ علاقہ بہت پس ماندہ ہے قدم قدم پر چور لٹیرے بھی ملتے ہیں اس لیے تم رات نہ کرنا۔ تمہارے پاس رقم ہوگی۔

یہ سن کر ندیم کو سبکی کا احساس ہوا۔ تب اس نے ڈرائیونگ کرتے کرتے اپنی یادداشت کو کھنگالا اور انگریزی میگزینوں کے سرسری مطالعے کی یادوں کو جمع کر کے عورت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہم لوگ اکثر کینیڈا میں بسے اپنے ہم وطنوں کے خیال سے فکر مند رہتے ہیں کہ وہاں سرمنڈے لوگوں نے ایشیا والوں کو بہت پریشان اور ذلیل کر رکھا ہے۔"

ذلیل کے لفظ پر اس نے ضرورت سے زیادہ زور دیا تھا۔ عورت نے ندیم کی چالاکی کو سمجھ کر لیکن موقع کی نزاکت کو جانتے ہوئے ہولے ہولے ذکر کرنے والے انداز میں کہا تھا۔

"اس طرح کے گروہ لندن وغیرہ میں زیادہ ہیں۔ کینیڈا میں دوسری طرح کے مسائل ہیں۔"

وہ دیر تک ان مسائل کا ذکر کرتی رہی۔

ندیم کو اپنے ناقص مطالعے پر کچھ دیر تک شرمندگی محسوس ہوئی۔ تب اس نے موضوع بدلا اور بتانے لگا کہ جنگل میں روگ ہو جانے سے کیسے کیسے نقصانات ہوتے ہیں۔ اول تو یہ کہ جنگل کے تمام نارمل کام رک جاتے ہیں۔ جنگل کی کچی روڈ بنانے والے مزدور علاقہ چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ پتوں کی صفائی والی عورتیں جنگل میں آنا بند کر دیتی ہیں۔ جنگلات کی گھاس کے ٹھیکے اٹھنا بند ہو جاتے ہیں کہ کون اپنی جان جوکھم میں ڈال کر گھاس کٹوائے گا۔ شہد کے ٹھیکے دار کام چھوڑ دیتے ہیں۔ جنگلات کے افسران اس عرصے میں جنگل کی لکڑی چوری کرنے والوں کو مدعو نہیں کر پاتے۔ اور تو اور ہم لوگ پوچنگ تک نہیں کر پاتے کہ کب کس درخت کے پیچھے سے یا اونچی اونچی گھاس یا جھاڑی کے پیچھے سے آنکھیں سرخ کئے سونڈ اٹھائے چنگھاڑتا ہوا روگ نہ نکل پڑے اور کچل کر رکھ دے۔

رینجری پہنچنے سے کچھ دور پہلے ہیڈلائٹس اس لکڑی کے کھمبے پر پڑیں جس پر ایک پٹی لگی تھی جس پر ہندی میں لکھا تھا۔

ہوشیار! یہ ہاتھیوں کے گزرنے کا راستہ ہے

راجو نے بھی اسے پڑھا اور کھسک کر عورت کے پہلو میں گھس گیا۔

اچانک ندیم نے ہیڈلائٹس بند کر کے گاڑی روک دی۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی اور سب کا توازن بگڑ گیا۔ گاڑی رکنے سے جنگل کا سناٹا واضح ہو گیا تھا۔

"سامنے ہاتھی سڑک پار کر رہے ہیں۔" ندیم نے دھیمے سے کہا۔

سب نے سانس روکے دور سڑک پر بھدے بھدے سیاہ دھبوں کو پولے پولے قدموں سے سڑک پار کرتے دیکھا۔ گاڑی کے باہر اور اندر سناٹا چھایا رہا۔

کچھ دیر بعد ندیم نے گاڑی اسٹارٹ کی اور بہت تیز رفتاری سے چلاتا ہوا نشان گاڑا رینجری تک لایا۔ گاڑی روک کر اس نے عورت کو دیکھا پھر سہمے ہوئے بچے کو دیکھا۔ اور گاڑی سے اترنے سے پہلے بچے کو مخاطب کر کے بتایا کہ روگ غول میں نہیں ہوتا۔ غول کے ہاتھی عموماً بے ضرر ہوتے ہیں۔ روگ سب سے الگ تھلگ ہوتا ہے۔

رینجری میں الاؤ جلتا اور کئی لوگوں کو تاپتا دیکھ کر راجو کے چہرے کا پیلا پن دور ہوا۔ اس نے اترتے اترتے پوچھا۔

"کئی پاگل ہاتھی جمع ہو جائیں تو غول نہیں بن جائے گا کیا؟"

عجیب بے تکی باتیں کرتا ہے۔ ندیم نے گاڑی سے اتر کر دروازہ بند کرتے ہوئے سوچا۔

رینجر صاحب پوری وردی پہنے سب سے ہاتھ ملا رہے تھے۔

"آپ کا بچہ ہے؟" انھوں نے ندیم سے پوچھا۔

"نہیں یار! یہ لوگ بردلی میں ملے تھے۔" اس نے پورا معاملہ سمجھایا۔

"تب تو بڑی دقت ہوگی۔ ڈی۔ ایف۔ او صاحب تو موتی پور والے راستے سے نیپال نکل گئے

ہیں۔ وہاں کسٹم چوکی پر اپنا ایک آدمی پکڑا گیا ہے۔"

یہ سن کر عورت کے چہرے پر بے چارگی دوڑ گئی۔ وہ ایک ایک کا منھ دیکھنے لگی۔

"میں وائرلیس بھیج کر لکھنؤ سوچتا بھیج دوں کہ آپ کے گھر خیریت بتا دیں؟"

"لیکن ان کے جانے کا مسئلہ کیسے طے ہوگا؟" ڈاکٹر وقار نے پوچھا۔

ندیم نے عورت کے پاس آکر کہا۔

"آپ رینجری پر رینجر صاحب کے گھر آرام کریں۔ ان کی بیوی بہت اچھی ہیں۔ ہم سب کو بھائی مانتی ہیں۔"

عورت شش و پنج میں تھی کہ رینجر صاحب نے مطلع کیا کہ ان کی فیملی دو دن ہوئے میکے چلی گئی کیوں کہ روگ کی وجہ سے پورے جنگل میں دہشت پھیلی ہوئی ہے۔ بچوں کے نانا آکر اپنی بیٹی اور نواسوں کو لے گئے۔

اس وقت کا منظر یہ تھا کہ لوہے کے تار کی باڑھ میں گھری رینجری کی سرخ پرانی عمارتوں کے درمیان الاؤ کے پاس رینجری کا پورا اسٹاف، دو موٹر سائکلیں، اسٹیشن ویگن اور بہرائچ سے آئے شکاری اور وہ عورت اور وہ بچہ........ سب کے سب الاؤ کی روشنی میں ہیولوں کی طرح لگ رہے تھے۔ الاؤ کی آگ تیز ہوتی تو ان سب کی پرچھائیاں بڑھ جاتیں۔ الاؤ کی آگ مدھم پڑتی تو پرچھائیاں سمٹ جاتیں۔ رینجری کے چاروں طرف پھیلا جنگل، ساگون اور ساکھو اور شیشم کے اونچے اور مضبوط اور تناور درختوں کا جنگل دبیز کہرے کے نیچے بالکل خاموش کھڑا تھا۔ اس جنگل میں نزدیک یا دور بہت سے حیوان یا تو اونگھ رہے ہوں گے یا خاموشی لیکن تیزی سے چگ رہے ہوں گے یا چر رہے ہوں گے یا پانی پی رہے ہوں گے یا غول میں کھڑے ہوں گے یا اپنی ماداؤں کو اپنے سینگوں سے چھو رہے ہوں گے یا اپنے بچوں کے بدنوں کو چاٹ رہے ہوں گے یا اپنے شکار پر حملہ کر رہے ہوں گے یا بھوکے پیٹ جنگل کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں بھاگ کر اپنی خوراک یا اپنا شکار تلاش کر رہے ہوں گے۔

عورت بہت بے بسی سے سب کو دیکھ رہی تھی اُسے محسوس ہوا اس کی آنکھوں سے آنسو نکلنے ہی والے ہیں۔

"ہم لوگ لیٹ ہو رہے ہیں۔" ڈاکٹر وقار نے خاموشی کو توڑا۔ "کیا آج کی کوئی خبر ہے؟"

"جی ہاں" رینجر صاحب آگے بڑھے۔ "آج موتی پور بلاک میں پرانے گیسٹ ہاؤس والے جنگل میں ساگوان کے ۱۹۵۵ پلاٹ کے آس پاس پگ مارک دیکھے گئے ہیں۔"

"آج تو آپ شیر کے شکار کی زبان بول رہے ہیں۔" آصف مسکراتے ہوئے بولے۔

"نہیں جی۔ بات ایسی ہے کہ سب لوگ بہت ڈرے ہوئے ہیں۔ اسے سامنے دیکھ لیں تو وہیں ٹھور دم نکل جائے۔ رینجری چھوڑ چھوڑ کر سب کے پریوار چلے گئے ہیں۔ جس دن سے رینجری میں گھس کر اس نے چوکی دار کو کچل کر مارا اسی دن سے یہ حالت ہوئی ہے۔ آج تو آپ لوگ اس کا بنس ہی مٹا کر جانا۔"

"اللہ مالک ہے۔" ڈاکٹر وقار بولے۔

"پھر کیا سوچا بھائی؟" ڈاکٹر وقار نے ندیم اور عورت کے پاس آکر پوچھا۔

ندیم خاموش کھڑا راجو کو ماچس سے ایک چھوٹا سا الاؤ جلاتے دیکھتا رہا۔

عورت نے دھیرے سے لیکن اعتماد کے ساتھ کہا۔

"آپ میرے گھر وائرلیس سے انفارم کرا دیجئے اور مجھے بھی گاڑی میں لے چلئے۔ یہاں رینجری میں مت چھوڑیئے گا۔"

"آپ سوچ لیں۔ آپ کے ساتھ بچہ ہے۔ آپ لوگ روگ کو دیکھ کر ڈر نہ جائیں۔"

"اب جو ہوگا سو ہوگا۔ مجھے جنگلی جانوروں سے ڈر نہیں لگتا۔ میں..... ہم لوگ شادی کے بعد افریقہ کے جنگل میں..... زمبابوے میں شکار..... ہنی مون پر گئے تھے.... پرمٹ لے کر گئے تھے... میں نے خود ایک بائسن مارا تھا۔"

ندیم کو یہ سن کر حیرت ہوئی اور اطمینان بھی۔

"مگر راجو....." ندیم بولا۔

"میرے پاس چپکا بیٹھا رہے گا۔" عورت نے جواب دیا۔

ویگن میں مزید پٹرول ڈالا گیا۔ الاؤ کے چاروں طرف بیٹھ کر سینڈوچ کھائے گئے، چائے پی گئی، سگرٹیں سلگائی گئیں۔ باتھ روم جایا گیا۔ رائفل اور بندوقیں ایک بار پھر چیک کی گئیں۔

"اسٹریچی وہی رہے گی کہ اگر قریب سے موقع دیتا ہے تب تو فایر ہوگا ورنہ بندوقوں سے فایر کر کے بھگا دیں گے کیوں کہ اوچھا ہاتھ پڑا تو وہ زخمی ہو کر کچھ بھی کر سکتا ہے۔"
ڈاکٹر وقار آصف، راشد اور ندیم کو سمجھا رہے تھے۔

رینجری کا اسٹاف اور رمیش کپڑے سے ویگن کے شیشوں کو رگڑ رگڑ کر صاف کر رہے تھے جن پر کہرا جم گیا تھا۔ سردی اتنی شدید تھی کہ دو تین منٹ بعد پھر کہرا جم جاتا تھا۔

"سرچ لائٹ چیک کر لی ہے نا؟" ڈاکٹر وقار نے پوچھا۔

"جی ہاں،" رمیش نے کپڑا نچوڑتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ کہرا پریشانی پیدا کرے گا۔ گاڑی کے شیشے بند ہوں گے تو اندر بھی نمی جمے گی۔" ڈاکٹر وقار نے اندیشے کا اظہار کیا۔

"اب اس کا تو کوئی علاج ہی نہیں ہے۔ آج ہی کم بخت اتنا جاڑا اور کہرا پڑنا تھا۔" ندیم نے بڑبڑاتے ہوئے جواب دیا۔

رینجری کی طرف اندر آنے والی کچی سڑک پر دور ایک لائٹ نظر آئی اور پھر موٹر سائیکل کا دھیما دھیما گھن گھن کرتا شور..... موٹر سائیکل قریب آ کر رک گئی اور اس پر سے دو آدمی ہڑبڑائے ہوئے نیچے اترے۔ ان میں ایک کے ہاتھ میں بندوق تھی۔

"رینجر صاحب کون ہیں؟" جس کے ہاتھ میں بندوق نہیں تھی اس نے پوچھا۔

"میں ہوں۔" رینجر صاحب گھبرائے ہوئے ان کی طرف بڑھے... الاؤ کے پاس کھڑے ہونے سے ان کا ماتھا پسینے سے بھیگ گیا تھا وہ بہت مضطرب نظر آ رہے تھے۔

"کیا روگ نے پھر کہیں...؟"

"جی نہیں..... بجنور سے سوچنا آئی ہے کہ جس ریل کے ڈبے میں آپ کے سسر اور فیملی..." وہ دھیمے دھیمے سرگوشیاں کرنے لگے۔

رینجر صاحب اپنے بچوں کا نام لے لے کر چیخ مار مار کر رونے لگے۔

ڈاکٹر وقار نے انھیں ڈانٹنے کے انداز میں سمجھاتے ہوئے مصنوعی غصے کے لہجے میں کہا "پوری بات تو سن لیں کیا کوئی کیجولٹی ہوئی ہے....."

"پوری بات فون پر صاف صاف سنائی نہیں دی۔ بہت دھیمے دھیمے کٹ کٹ کر آواز آرہی تھی۔" ان میں سے معمر شخص بولا۔

"کیا چور ڈاکوؤں والا معاملہ ہے؟" عورت نے ندیم کے پاس آکر گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"معلوم نہیں۔ بتا رہے ہیں فون پر آواز صاف نہیں آرہی تھی۔"

"ادھر تو آج کل وہ والے جھگڑے بھی بہت چل رہے ہیں۔" آصف نے دھیمے سے کہا۔

"ہو سکتا ہے ترائی والا معاملہ ہو۔" راشد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ترائی تو وہاں سے دور ہے یار۔" ندیم بولا۔

"ترائی دور ہے لیکن اصل جگہ تو پاس ہے۔"

"ویسے ہی ٹامک ٹوئیاں مارنے سے فائدہ، تم لوگ باتیں بہت کرتے ہو۔" اچانک ڈاکٹر وقار کا لہجہ بہت خوفناک ہو گیا تھا۔ سب ان کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔

اپنے لہجے پر قابو پاتے ہوئے انھوں نے کہا۔

"آپ موٹر سائیکل پر روانہ ہو جائیں۔ اور پہلے بہرائچ جا کر بجنور فون کریں تب سفر کا ارادہ کریں۔ اسٹاف میں سے کسی کو ساتھ لے جائیے۔ موٹر سائیکل خود نہ چلائیے گا۔"

رینجر صاحب کے جانے کے بعد سب لوگ بہت دیر تک خاموش رہے، البتہ لکڑی کا کوئی کوئی ٹکڑا الاؤ میں چٹختا تو سناٹا ٹوٹ جاتا۔

"اصل میں بات یہ ہے۔" ڈاکٹر وقار نے الاؤ کی طرف منہ کر کے ہاتھ تاپتے ہوئے کہا۔ "کہ آج کل ہر طرف..... یعنی ہر علاقے میں..... مطلب یہ کہ سب لوگوں میں....."

پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد انھوں نے کہا۔

"اب جس کام سے آئے ہیں اس کی بسم اللہ کی جانی چاہیے۔ چلئے گاڑی میں بیٹھئے۔"

ندیم کے ساتھ آگے ڈاکٹر وقار بیٹھے۔ پیچھے کی سیٹ پر آصف، عورت، راجو اور راشد اور سب سے پچھلی سیٹ پر ریش اپنی بندوق لے کر بیٹھ گیا۔

راشد نے محسوس کیا کہ عورت بار بار کن انکھیوں سے ریش اور اس کی بندوق کو دیکھ

رہی ہے۔ راشد کچھ سوچ کر مسکرایا لیکن مسکراہٹ کی لکیر ابھی بانچھوں تک بھی نہیں گئی تھی کہ راشد کے ماتھے پر لکیریں پڑ گئیں۔ وہ بھی آنکھ بچا کر ریش اور اسکی بندوق کو دیکھنے لگا۔

جس وقت رینجر صاحب کی بیوی بچوں پر حملے کی اطلاع دی جا رہی تھی اس وقت ریش کا چہرہ کیسا سرخ ہو گیا تھا، آصف نے سوچا۔

پھر کچھ یاد آیا کہ اسی وقت رینجری کے اسٹاف میں سے کسی شخص نے ریش سے سرگوشی کی تھی کہ بجنور کے علاقے میں آج کل وہ والے جھگڑے بھی تو چل رہے ہیں۔ یہ بات رینجری کے اسٹاف کے کسی شخص نے کہی تھی کہ ندیم نے یا دونوں نے؟۔ یا دونوں نے نہیں کہی تھی، صرف میں نے ہی ایسا سوچا تھا۔ یا میں نے ایسا کہا تھا۔ آصف کے ذہن نے کام کرنا بند کر دیا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔

ڈاکٹر وقار نے میگزین میں گولیاں ڈالیں، بولٹ کھینچ کر برابر کیا اور رائفل تیار کر کے چوکس بیٹھ گئے۔

آصف نے اپنی بندوق میں گولی والے کارتوس لگائے اور کھڑکی سے لگ کر بیٹھ گیا۔

راشد نے سرچ لائٹ کا ہینڈل کس کے پکڑا اور آنکھیں ونڈ اسکرین پر گاڑ دیں۔ عورت نے اپنے اوور کوٹ کے بند کو کسا اور راجو کو اپنے پہلو سے چمٹا لیا۔

ریش نے ایک نالی میں کارتوس بھرا اور کھڑکی کے پاس جم کر بیٹھ گیا۔

"آپ لوگ اب آواز نہ نکلئے گا۔ ہاتھی کے کان بہت تیز ہوتے ہیں۔" ڈاکٹر وقار دھیمے سے بولے۔

"ابھی تو وہ اسپاٹ دور ہے۔" ندیم نے کہا۔

"پھر بھی خاموش رہنے میں کیا ہرج ہے۔"

ندیم نے ڈیش بورڈ سے کپڑا نکال کر اندر سے شیشہ صاف کیا۔ لیکن باہر بھی کہرا جما ہوا تھا۔ اسنے وائپر آن کیا۔ وائپر کا بلیڈ پورے شیشے پر تیزی سے چلا تب معلوم ہوا کہ شیشے کی اندرونی سطح پر بھی نمی ہے۔ باہر سب کچھ دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا... صرف ہیڈ لائٹس کی

دونوں شعائیں واضح تھیں۔

"گاڑی کے شیشے کھول دیں تو اندر کی نمی چھٹ جائے۔" ندیم نے کہا۔

"یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ مطلب یہ اس وقت خطرناک ہے۔" ڈاکٹر وقار دھیرے سے بولے۔

"پھر تو اندر ایسے ہی کہرا جما رہے گا۔ باہر کا کچھ بھی صاف نظر نہیں آئے گا۔"

راشد نے تشویش کے ساتھ کہا۔

"مجبوری ہے۔" ڈاکٹر وقار نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

آصف نے اندر بیٹھے بیٹھے پوری گاڑی میں نظر دوڑائی اور کہا۔

"سائڈ اور پیچھے کے شیشے سے تو کچھ بھی نظر نہیں آرہا۔"

"ادھر تو باہر کی طرف روشنی بھی نہیں ہے، مطلب ہیڈلائٹس۔" راشد نے کہا۔

"جیسے جیسے گیروا ندی قریب آئے گی کہرا اور جمے گا۔" ندیم بڑبڑایا۔

"تُم واپر آن رکھنا ندیم۔" ڈاکٹر وقار نے ہدایت دی۔

"واپر آن رکھوں تو بیٹری کمزور ہو جائے گی۔" ندیم بڑبڑایا۔

گاڑی دھیرے دھیرے چل رہی تھی اور ہیڈلائٹس کی دھندلی روشنی میں کہرے کے دھویں کے مرغولے چکر کھا رہے تھے۔ اور دھندلی روشنی اور کہرے کے مرغولوں کے آگے سڑک کے دونوں طرف پھیلے جنگلوں میں کوئی بھی شے صاف نہیں نظر آرہی تھی۔

"سامنے کیا چیتل جا رہا ہے؟" ندیم نے سڑک پر نظر جما کر ڈاکٹر وقار سے پوچھا۔

انھوں نے غور سے دیکھا اور بتایا۔

"خرگوش ہے یار۔ کہرے میں سب چیزیں ہیولا سی لگتی ہیں، اپنے سے کئی گنا زیادہ۔"

گاڑی کی آواز سن کر خرگوش رک گیا تھا۔ اس کی آنکھوں پر گاڑی کی روشنی پڑی تو اس کے سر پر دو نیلے بلب روشن ہو گئے۔

"ارے... اس کی آنکھیں کیسی چمک رہی ہیں۔" راجو چلایا۔

"چپ رہو..... چپ۔" ڈاکٹر وقار نے اسے ڈانٹا۔ پھر پیچھے ہاتھ بڑھا کر اسکاشانہ تھپ تھپایا۔

بار اڑتیں اور بار بار بیٹھ جاتیں۔

سورج کچھ اور چمکا اور بوڑھے سردار نے دیکھا کہ کالو کے جسم کا ایک ایک رواں چمک اٹھا ہے۔ آج اسے پہلی دفعہ یہ احساس ہوا کہ کالو بہت تندرست اور طاقت ور ہے۔ کالو کے جسم کا ایک ایک عضو اپنی جوانی کا ثبوت دے رہا تھا۔ خوب کھنچے ہوئے کالے چمکدار سینگ، بھری کمر اور پر گوشت سینہ اور جسم کے ہر حصے کی وہ مخصوص تھرکن جو ہرن کا خاصہ ہے۔ یہ مخصوص تھرکن اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہرن لمبا میدان دوڑنے کیلئے خود کو تیار کرتا ہے یا جب اسے کسی سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ بوڑھا سردار جانتا ہے کہ یہ تھرکن جوان ہرن کے جسم میں شدت کے ساتھ کب پیدا ہوتی ہے اور اس کے بعد پھر کیا ہوتا ہے۔ ویسے بھی وہ کچھ دنوں سے اپنے غول میں اس اعتماد کے اٹھ جانے کا احساس کر رہا تھا جو اس نے اپنے سردار کو ختم کرنے کے بعد حاصل کیا تھا۔ سردار نے دیکھا مادائیں بالکل پرے ہٹ کر کھڑی ہو گئی ہیں اور سارے ہرن اس کی طرف دیکھ رہے ہیں، شروع دن کی دھوپ کی ٹھنڈی چمک میں کالو کا سیاہ روئیں خوب چمک اٹھا تھا اور بل کھائے ہوئے چمکیلے سینگ بھی خوب کوڑے اٹھے تھے۔ کالو نے دیکھا کہ دھوپ میں چمک آتے ہی سنہری کا بدن اور صاف ہو گیا ہے اور رانوں کے پچھلے حصے کا روئیں سونے کے تاروں کے مانند چمک رہا ہے اور ادھر بوڑھے سردار کے زخم خوب واضح ہو گئے ہیں اور زخموں پر بیٹھی مکھیوں کی تعداد میں پہلے سے اضافہ ہو گیا ہے۔ کالو نے سنہری کی گھنٹی گھنٹی پہلی کنواری اور معصوم آواز ابھی ابھی سنی تھی جو ہرنی جوان ہونے کے بعد پہلی بار منہ سے نکالتی ہے۔ ریت کے ذرے چمکے، کالو کے پیروں میں حرکت پیدا ہوئی۔ غول کے تمام ہرنوں نے مٹی پر کھر مار کر اسکی ہمت افزائی کی۔ یکبارگی کالو زمین پر سر مار کر، سر تھوڑا سا نیچے کر کے سینگ تان کر بوڑھے سردار پر جھپٹ پڑا اور نکیلے سینگ اس کی چھاتی میں گڑو دیے۔ سردار زمین پر ہی ایک دفعہ کو ڈگمگایا، سنبھلا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے یہ سوچنے میں اتنی دیر بھی نہ لگی جتنی دیر ایک کھیت سے دوسرے کھیت تک جانے میں لگتی ہے کہ آج کالو کے ہاتھ وہی گھڑی آ گئی جو پچھلے وقتوں میں بوڑھے سردار کو خود اس کے ہاتھوں دیکھنا

تب اس وقت ریش کو محسوس ہوا کہ راجو کے علاوہ گاڑی میں بیٹھے ہر شخص نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا تھا۔ اس نے باری باری سب کو دیکھا۔

تب راجو کے علاوہ سب کو محسوس ہوا کہ ریش سب کی طرف ایک عجیب انداز سے دیکھ رہا ہے۔ گاڑی میں اندھیرا تھا لیکن آنکھیں اتنے اندھیرے سے مانوس ہو چکی تھیں۔

راجو کے علاوہ سب کے سب ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہے تھے۔

راجو نے چہرہ اٹھا کر دھیمے سے پوچھا۔

"ایں آنٹی... دروغہ جی کے بیوی بچوں کو کس نے مارا؟"

ندیم نے بریک لگا دیئے۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی۔ ندیم نے لائٹ بجھا دیں۔

"سامنے روگ کھڑا ہے۔" اس کے منہ سے اور کچھ نہیں نکلا۔

خوف کی ٹھنڈی ٹھنڈی لہریں سب کی پشت اور شانوں اور کمر کے پاس لہرائیں۔

"کس طرف ہے؟" ڈاکٹر وقار نے رائفل کی سیفٹی "آن" پر کرتے ہوئے اتنے آہستہ سے پوچھا کہ انھیں یقین نہیں ہوا کہ ندیم نے ان کی آواز سنی ہوگی۔

"سڑک کی داہنی سمت سے شاید بائیں طرف آ رہا تھا۔ یا شاید سامنے سے دائیں یا بائیں سائڈ میں آ رہا تھا۔" ندیم نے بتایا۔

"ندیم لائٹس..... نظر کیسے آئے گا۔" ڈاکٹر وقار نے کہا۔

ندیم لائٹ آن کرنے ہی والا تھا کہ ریش نے بے چینی کے ساتھ کہا۔

"پیچھے کی طرف ہے، بالکل گاڑی کے پاس۔"

سب نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تاریک سڑک پر کچھ تھا۔

آصف نے اچانک اپنا ہاتھ بڑھا کر ڈاکٹر وقار کا شانہ دبایا.....

"ادھر ہے میری طرف کی کھڑکی کے پاس... بالکل قریب۔"

سب نے اس کھڑکی کے پار دیکھا تو وہاں دھند میں کوئی دھبہ سا کھڑا محسوس ہوا۔ سب کے دلوں کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔

"میری کھڑکی پر اس نے ابھی باہر سے سونڈر رکھی تھی۔" راشد نے سرگوشی میں بتایا۔

راشد کی طرف والی کھڑکی کے باہر کوئی لمبی سی شے بل کھاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

ندیم نے سب کو چپ رہنے کا اشارہ کیا اور بتایا۔

"میری طرف والا روگ تو ابھی بھی وہیں کھڑا ہے شاید۔"

"کیا تمھیں بالکل صاف نظر آ رہا ہے۔ نشانہ لے کر فائر کر سکتے ہو؟" ڈاکٹر وقار نے پوچھا۔

"بالکل صاف تو نہیں ہے۔ شیشہ بہت دھندلا ہے۔ شیشہ گرا دوں؟"

"ہرگز نہیں... بالکل نہیں۔ شیشہ گرتے ہی اسے ہماری سانسیں تک صاف سنائی دیں گی۔"

عورت نے بچے کے چہرے کی طرف دیکھا جو دہشت سے سفید پڑ گیا تھا۔ وہ پہلو میں گھسا گردن گھما گھما کر چاروں طرف کے شیشوں کے پار دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

عورت نے آنکھیں بند کر کے اپنے چہرے کے ٹھنڈے پسینے پر ہاتھ پھیرا اور اوور کوٹ پر ہاتھ خشک کیا۔

"وہ آہستہ آہستہ ادھر ہی بڑھ رہا ہے۔" رمیش نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔ وہ شیشے سے ناک چپکائے مسلسل ویسے ہی بیٹھا ہوا تھا۔

آصف اور راشد نے بھی اپنے اپنے شیشوں کے پار دیکھتے ہوئے یہی بات بتائی۔

ڈاکٹر وقار خوف، شش و پنج اور اضطراب کی ملی جلی کیفیت میں بولے۔

"یہ دیکھو کہ کس کا دانت ٹوٹا ہوا ہے۔ اصلی روگ وہی ہے۔ اور خطرناک بھی صرف وہی ہے۔"

سب نے اندھیرے میں آنکھیں گڑا گڑا کر دیکھا اور بتایا کہ ان کی طرف والے شیشے کے پاس جو ہاتھی ہے اس کا دانت ٹوٹا ہوا لگ رہا ہے۔"

"کیا کئی روگ ہیں۔" ڈاکٹر وقار جیسے خود سے بولے۔ انھوں نے عورت کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھا جس نے ابھی ابھی ڈرتے ڈرتے باہر جھانکا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں۔ ڈاکٹر وقار کو اپنے شیشے پر باہر سے ایک دھمک سی محسوس ہوئی یا شاید دل زور سے دھڑکا تھا یا شاید رائفل کا کندہ جوتے سے ٹکرایا تھا۔

انھوں نے شیشے کے باہر گاڑھے اندھیرے میں جھانکا۔

اندھیرے میں محسوس ہوا کہ اس کی آنکھیں سرخ تھیں، ایک دانت ٹوٹا ہوا تھا اور سونڈ اوپر اٹھی ہوئی لہرا رہی تھی۔

انھوں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

"فایر نہیں ہوگا۔ ہم اتنے ایک ساتھ نہیں مار سکتے۔ ہماری گاڑی چاروں طرف سے روگوں میں گھری ہوئی ہے جب تک شیشے بند ہیں عافیت ہے کہ آواز باہر نہیں جارہی، ورنہ اب تک یہ ہم سب کو کب کے کچل چکے ہوتے۔"

"تو اب کیا کریں۔" ندیم نے بیٹھی بیٹھی کمزور آواز میں پوچھا۔

سب کو ایک عجیب طرح کے خوف، بے بسی اور شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا۔

"ہم لوگ..... صبح ہونے کا انتظار کر سکتے ہیں۔" عورت نے پھنسی پھنسی آواز میں دھیمے سے کہا۔

سب کے سب اس بات سے مطمئن ہو گئے تھے اگر اسی وقت بچے نے جیب سے نکال کر ایک چیز ہاتھ میں نہ لے لی ہوتی اور پھر بے ہوش نہ ہو گیا ہوتا....

ندیم نے کسی سے آنکھیں ملائے بغیر گھوم کر ہاتھ بڑھا کر بچے کی مٹھی کھولی۔ اس چیز کو دیکھا۔ ایک لمحے تک کچھ سوچا اور پھر مٹھی ویسے ہی بند کر کے مڑا اور باقی سب کی طرح سر جھکا کر خاموش بیٹھ گیا۔

عِلم اور عمل

یاد رکھو کہ

عِلم کے ساتھ عمل ضروری ہے

نہ عمل کے بغیر علم نافع ہے اور نہ عِلم کے بغیر

عمل نفع بخش ہے۔

جس عِلم کی پُشت پر عمل موجود نہ ہو

وہ علم جہل ہی کے زمُرے میں شامل ہے۔

—— حضرت داتا گنج بخش رح

کشفُ المحجوب سے

پڑی تھی اپنا اکلوتا سینگ لئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ دم کو زور زور سے ہلا کر زخموں پر بیٹھی مکھیوں کو ہٹایا۔

بدن کے ایک ایک عضو کو حرکت دیکر طاقت جمع کی اور دفاع کے لئے پوری طرح تیار ہو گیا۔ اتنے میں کالو بھی دوبارہ حملہ کرنے کے لئے تیار ہو چکا تھا وہ جھپٹ کر سردار سے بھڑ گیا اور اسے اپنے نکیلے سینگوں پر رکھ لیا۔ بوڑھا سردار ہر حملہ سوچ سوچ کر روک رہا تھا۔ کالی جلد پر جگہ جگہ خون کے فوارے چھوٹ پڑے جیسے اندھیری راتوں میں ارہر کی رکھوالی کرنے والوں نے جگہ جگہ الاؤ روشن کر رکھے ہوں۔ ایک دفعہ کو سردار نے اپنی پوری طاقت سے کالو پر حملہ کر دیا اور اپنے اکلوتے سینگ سے کالو کا جوان اور مضبوط سینگ توڑ دیا لیکن اس حملے میں اسے اپنا اکلوتا سینگ بھی کھونا پڑا۔

دونوں سینگ ٹوٹ چکے تھے اور اسے اپنا سردار یاد آرہا تھا جو دونوں سینگ کھو کر نہر میں ہمیشہ کیلئے غرق ہو گیا تھا۔ ادھر کالو اپنا جوان اور مضبوط سینگ کھو کر دیوانہ سا ہو گیا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ سردار کے دونوں سینگ ٹوٹ چکے ہیں تو اسے اپنی فتح کا یقین سا ہو گیا۔ ان دونوں جذبوں نے اس میں ایک نئی طاقت پھونک دی اور وہ بوڑھے سردار پر بری طرح ٹوٹ پڑا۔

جوان کالو اور بوڑھے سردار کے جسموں سے خون رستا رہا اور ریتیلی مٹی میں جذب ہوتا رہا۔ سردار آہستہ آہستہ پست ہونے لگا اور کالو کی ہمت بڑھتی رہی۔ سورج بالکل ان کے سروں پر آگیا تھا اور پرچھائیاں ان کے جسموں کے نیچے موت کا کھیل کھیل رہی تھیں۔ چاروں طرف بلا کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہوا بالکل ساکت تھی اور ایکھ کے کھیتوں کی سرسراہٹ بند ہو گئی تھی۔ ہرن پیر مار مار کر کالو کی ہمت افزائی کرنا بھول گئے تھے اور پرانی مادائیں بوڑھے سردار کے زخموں اور کالو کے حملوں کو بت بنی دیکھ رہی تھیں۔

کالو نے سنہری کو ایک بار دیکھا اور تڑپ کر اپنا سینگ بوڑھے سردار کے سینے میں گھونپ دیا۔ خون کا ایک نالا سا بہنے لگا اور سردار ڈگمگایا تو ڈگمگاتا ہی چلا گیا۔ اس نے

محسوس کیا کہ اب زندگی کی آخری سانسیں لینا ہیں۔ کیا ان ماداؤں کے سامنے اپنی آنکھوں کو پتھرا جانے دے جنھوں نے اس کے ہاتھوں اس کے سردار کی شکست دیکھی تھی؟ کیا وہ ان ماداؤں کے سامنے دم توڑ دے جو اس کے بوڑھے جسم کو سونگھ سونگھ کر بچے جنتی تھیں؟ کیا مرتے وقت وہ ان ارہر کے کھیتوں کو دیکھنے کی ہمت کر سکے گا جن میں اس نے بچپن اور جوانی نے سانسیں لی تھیں؟

اور پھر بوڑھا سردار بڑی تیزی سے مگر ڈگمگاتے قدموں سے نہر کی جانب بھاگنے لگا۔ خون سے تمام دھرتی سرخ ہو گئی تھی۔ نہر کے پاس پہنچکر اس نے مڑ کر سب کو آخری دم توڑتی نگاہوں سے دیکھا۔ کالو فتح کے نشے میں بیٹھا تھر تھرا رہا تھا۔ نئی اور پرانی مادائیں اسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھیں۔ ہرن دوڑ دوڑ کر رک رہے تھے اور رک رک کر بھاگ رہے تھے۔ جیسے کالو کی فتح کا جشن منا رہے ہوں۔ کالو اٹھ کر سنہری کی جوان تھوتھنی پر اپنا منھ رگڑ رہا تھا۔

سردار نے اپنی اگلی ٹانگیں نہر کے پانی میں ڈال دیں اور اپنا بوڑھا جسم نہر میں ڈھکیل دیا اور آہستہ آہستہ گہرے پانی میں غرق ہونے لگا۔

ادھر کالو سے الگ، ماداؤں سے دور سنہری سے پرے، ہرنوں کے ادھر ایک چھوٹا سا بچہ اپنی کالی کالی معصوم لیکن چمکتی ہوئی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا.... کبھی بوڑھے سردار کے آہستہ آہستہ غرق ہوتے ہوئے بوڑھے جسم کو، کبھی خون میں ڈوبے ہوئے کالو کے جوان بدن کو۔

اور سورج، جس کی گرمی سے ہرنوں کی جلد سیاہ پڑ جاتی ہے، جس کی روشنی سے ریت کے ذرے چمکنے لگتے ہیں، آسمان میں اپنا چکر پورا کر رہا تھا!

کل یہی سورج پھر نکلے گا۔

لکڑبگھا ہنسا

لکڑ بگھا ہنسا

کھڑکی کے نیم تاریک شیشوں کے پرے بچی کھچی رات تیز اور سرد ہواؤں کے ساتھ بہتی رہی۔ کمرے کے اندر بہت حبس تھا اور نیلے بلب کی مدھم روشنی بہت ہیبت ناک اور پراسرار محسوس ہو رہی تھی۔ منو بھیا کے علاوہ سب لوگ اپنے اپنے بستروں میں پڑے جاگ رہے تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ منو بھیا کے علاوہ سب لوگ جاگ رہے ہیں لیکن ایک جانے بوجھے خوف کی بنا پر کوئی اس بات کا اظہار نہیں کر رہا تھا کہ اسے معلوم ہے کہ دوسرے لوگ جاگ رہے ہیں اور یوں جاگنے والا ہر شخص تنہا نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو سب سے دور محسوس کر رہا تھا۔

سب کے دل بہت زور زور سے دھڑک رہے تھے اور لگ رہا تھا جیسے کوئی چیز نرخرے پر رینگ رہی ہو۔

تبھی بڑی اپّی نے سانس روکے روکے بہت پراسرار آواز میں امّی سے پوچھا...

"کیا منو بھیا کو لکڑ بگھا دکھانے کے لیے چڑیا گھر لے جانا ضروری ہے امّی؟"

سب نے ایک جھرجھری سی محسوس کی بڑی اپّی کی آواز کی گونج دوسرے ہی لمحے نیلی تاریکیوں میں ڈوب گئی تھی۔ لیکن ان کے سوال کے بعد جتنے پل گزرے وہ جاگنے والوں کے دلوں کی تیز تیز دھڑکنوں کو گنتے رہے۔

امّی نے پہلو بدل کر گھوم کر اس طرف دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی اور انھیں احساس ہوا کہ کمرے کے حبس میں مزید اضافہ ہو گیا ہے باہر کی ہوائیں کچھ اور تیز اور گمبھیر ہو گئیں۔ انھوں نے بڑی اپّی کی سہمی سہمی آنکھوں میں غور سے جھانکا اور کھوکھلی آواز میں کہا۔

"ہاں... اور کیا جنگل لے جاؤں گی منو کو لکڑ بگھا دکھانے..."

"جنگل نہیں امّی.... امّی.... آپ جاگ رہی ہیں نا؟ آپکو کچھ سنائی دے رہا ہے؟"
بڑی اپّی بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔
"سوجاؤ بٹیا۔ تم نیند میں ہو جو ایسے سوال کر رہی ہو۔ چلو سوجاؤ رات بہت بیت گئی ہے۔"
پاپا، بھائی جان اور چھوٹی اپّی، جو خاموش پڑے جاگ رہے تھے، جانتے تھے کہ بڑی اپّی نے یہ سوال نیند میں نہیں کیا ہے۔ خود امّی کو معلوم تھا کہ ایسے سوال نیند میں نہیں، ہوش کے عالم میں کئے جاتے ہیں لیکن کسی نے بڑی اپّی کے سوال کی ہمت افزائی اس ڈر سے نہیں کی کہ کہیں امّی صحیح جواب نہ دے دیں کہ جاگنے والوں میں صحیح جواب سننے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ خود بڑی اپّی سوال کرنے کے بعد سانس روکے دعا کرتی رہیں کہ امّی خاموش رہیں۔
باہر ہوا نے سانس بھری اور اچانک سب کے لاشعور میں پھر وہی بھیانک آواز گونجی۔ چٹ چٹ... چٹ چٹ... چٹ چٹ۔
اس آواز کو محسوس کرتے ہی سب کے دل اتنی شدت سے دھڑکے جیسے سینے سے نکل پڑیں گے۔ ایسا لگا جیسے نیم تاریک کمرے میں کوئی سایہ ڈول رہا ہے۔ سانس روکے بدن سکوڑے تمام جاگنے والے صبح ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ امّی نے پہلو بدل کر منّو بھیا کو لپٹا لیا تاکہ خود انکا خوف کم ہو اور پھر سوچا کہ یہ سب منّو بھیا کی وجہ سے ہوا۔
ادھر دس پندرہ دن سے ریلوے لائن کے اس پار دیہات میں ایک لکڑ بگھا لاگو ہو گیا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے ایک آدھ واردات کی خبر ملتی۔ منّو بھیا کو جب معلوم ہوا کہ لکڑ بگھا چھوٹے بچوں کا گوشت بہت شوق سے کھاتا ہے تو لکڑ بگھا ان کے وجود پر اپنے پورے وجود کے ساتھ حاوی ہو گیا۔ انہوں نے کبھی لکڑ بگھا دیکھا تھا نہ اسکی تصویر۔ بچپن ہی سے بس اسکا نام سن رکھا تھا۔ جب بھی اسکا نام سنتے تو اس کے ساتھ کسی معصوم بچے کی لاش کا ذکر ہوتا تھا۔ اسی لئے وہ اس ان دیکھے دشمن سے بہت خوف زدہ تھے۔ آج شام کو انہوں نے پھر یہ خبر سنی تھی کہ ریلوے لائن کے پار لکڑ بگھا ایک بچے کو اٹھا لے گیا ہے یہ خبر سنتے ہی ان کے چہرے پر سفیدی دوڑ گئی تھی۔ شام کو وہ گھر سے باہر نہیں نکلے۔

آنگن سے ڈرائنگ روم تک وہ سہمے سہمے، ڈرے ڈرے، خاموش گھومتے رہے۔ رات کو بھائی جان کے دوست اختر بھائی نے ان کا ڈر دور کرنے کے لئے انہیں ڈھارس دی کہ وہ لکڑ بگھے سے اس سلسلے میں گفتگو کریں گے کہ وہ اس علاقے میں نہ آئے۔ گیارہ بارہ برس کے منو بھیا میں اتنی ہمت بھی نہ ہوئی کہ پوچھیں کہ کیا لکڑ بگھا ہماری آپ کی طرح باتیں کر لیتا ہے لیکن یہ تصور کر کے ان کے خوف میں مزید اضافہ ہو گیا تھا کہ لکڑ بگھا باتیں بھی کر لیتا ہے۔ انہیں لکڑ بگھا ایک عجیب و غریب سی چیز محسوس ہوئی۔ لکڑ بگھے کی صحیح جسامت کا بھی انہیں اندازہ نہیں تھا۔ ان کے دوست لوگوں نے انہیں بتایا تھا کہ لکڑ بگھا دیوار کے برابر اونچا ہوتا ہے تبھی تو دیوار پھلانگ کر بچوں کو اٹھا لیجاتا ہے۔

پاپا اور امی نے بتایا تھا کہ لکڑ بگھا کتے کے برابر ایک وحشی جانور ہوتا ہے۔ بھائی جان، بڑی آپی اور چھوٹی آپی نے اسکی جسامت کے بارے میں زیادہ وضاحت اسلئے نہیں کی کہ انہوں نے خود کبھی لکڑ بگھا نہیں دیکھا تھا۔

رات کو سوتے وقت منو بھیا نے کرکٹ کا بلا اور ماچس گدے کے نیچے چھپا کر رکھ لئے۔ انہوں نے چوتھے درجے میں پڑھا تھا کہ جنگلی جانور آگ سے ڈرتے ہیں۔

شام سے ہی لکڑ بگھے سے متعلق ان کے چھوٹے سے ذہن میں عجیب و غریب بھیانک خاکے بن رہے تھے تو رات کو جب وہ سونے کے لئے لیٹے تو ان خاکوں نے مل جل کر ایک نہایت خوفناک صورت اختیار کر لی۔

بھائی جان نے اٹھ کر تمام دروازوں کی کنڈیاں دیکھیں، کھڑکیوں کی سٹکنیاں بند کیں پڑوس میں آواز دیکر ہوشیار رہنے کی تلقین کی اور آکر بتایا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے ایک آدھ دن میں لکڑ بگھا پکڑا جائے گا یا مارا جائے گا پڑوس میں بھی لکڑ بگھے کی وجہ سے کافی دہشت تھی۔ لوگ شام ہی سے دروازہ بند کر کے گھروں میں قید ہو جاتے تھے اور دھیان رکھتے تھے کہ چھوٹے بچے نظر کے سامنے ہی رہیں۔ ان مکانوں میں زیادہ خطرہ محسوس کیا جا رہا تھا جو ریلوے لائن کے پاس بسے ہوئے تھے۔ منو بھیا کا گھر بھی ریلوے لائن کے بالکل قریب تھا۔

اعتقاد

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ

(القرآن الحکیم، سورۃ الاعراف)

کہانیاں کہتے رہو کہ لوگ کچھ تو سوچ بچار کریں

منو بھیا اپنا سہما سہما چہرہ لئے امی سے لپٹ کر سو گئے تو پاپا نے ایک بار پھر دروازوں کے پاس جا کر آہٹ لی، کنڈیوں کو دیکھا اور آ کر پلنگ پر لیٹ گئے۔

باہر دسمبر کی سرد رات تھی اور ہوائیں بہت تیز تھیں کہ اچانک منو بھیا کی چیخ سنائی دی اور سارا گھر جاگ پڑا جسکے بعد سے اب تک کوئی نہیں سو پایا تھا اور اس درمیان حالات کی تفصیل یہ ہے کہ امی نے گھبرا کر پوچھا تھا۔

"کیا بات ہے منو بھیا.... کیا ہوا... کیوں چیخے؟"

"امی... امی..." منو بھیا نے ان کے بدن میں اپنا سر چھپا لیا۔

"کیا ہوا بتاؤ۔ جلدی بتاؤ بیٹے۔" پاپا نے گھبرا کر پوچھا۔

"امی.... لکڑ بگھا.... میرے پاس کھڑا تھا، مجھے اس نے جھک کر سونگھا۔"

"نہیں منو بھیا تم نے خواب دیکھا ہوگا۔"

پاپا، بھائی جان، بڑی آپی، چھوٹی آپی سب کے سب امی کے پلنگ کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ منو بھیا کے چہرے کا سارا خون جیسے غائب ہو گیا تھا۔ آنکھیں خوف کے مارے پھٹی پڑ رہی تھیں اور ہونٹ بالکل خشک ہو گئے تھے۔

"نہیں امی.... میں نے دیکھا وہ دیوار اتنا اونچا تھا۔ اپنی لمبی گردن جھکا کر اس نے مجھے سونگھا اور بڑے بڑے سینگ چبھو دیئے۔"

سب کی نند اسی آنکھیں چمکنے لگیں۔ تب پاپا نے کہا۔

"بیٹے منو — لکڑ بگھا دیوار کے برابر نہیں کتے جیسا ہوتا ہے اور اس کے سینگ کب ہوتے ہیں۔ تم نے خواب دیکھا تھا۔ کلمہ پڑھکر سویا کرو بیٹا۔"

"کلمہ پڑھا تھا پاپا اور الحمد بھی۔"

منو بھیا نے امی کی گود میں سر رکھکر رونا شروع کر دیا۔

سب کو عجیب سی دشواری کا احساس ہو رہا تھا کہ منو بھیا کو کیسے یقین دلایا جائے کہ لکڑ بگھے نے نہیں اس کے خوف نے انہیں ڈرایا ہے۔ تبھی امی نے کہا تھا۔

"بیٹا منو میں تمہیں بتاتی ہوں کہ لکڑ بگھا کیسا ہوتا ہے تاکہ تمہارے دل سے اسکا

خوف نکل جائے۔"

سب اپنے اپنے بستروں میں لیٹ گئے اور امی کی بات پر ہوں ہاں کرنے لگے تاکہ منو بھیا کو اطمینان رہے کہ سب جاگ رہے ہیں۔ کھڑکیاں اور دروازے ہوا کے زور سے ہولے ہولے بج رہے تھے۔ جن کی آوازیں ماحول کو اور زیادہ دہشت ناک بنا رہی تھیں۔ سب کے بدن میں خوف کی لہریں سی دوڑ رہی تھیں۔ منو بھیا دھیمے دھیمے سسکتے رہے۔ اور اب امی نے جاگتے ہوئے لوگوں کے درمیان نیلے بلب کی روشنی میں عجیب سی آواز میں کہنا شروع کیا۔

"منو بھیا! یہ جو لکڑ بگھا.... سن رہے ہو تم؟ یہ جو لکڑ بگھا ہوتا ہے نا... یہ کتے جیسا ایک جانور ہوتا ہے لیکن کتوں کے درمیان کھڑا کر دو تو آسانی سے پہچان لو گے۔ یہ بہت حاسد اور خوں خوار جانور ہوتا ہے بیٹا.... لیکن بہادر بالکل نہیں ہوتا۔"

بھائی جان نے ایک لمبی سی ہوں کر کے تائید کی تھی۔ سب کان لگائے امی کو سنتے رہے۔

"یہ ہمیشہ سادہ دل اور معصوم بچوں پر ہی حملہ کرتا ہے۔ مکاری سے پیچھا کرتا ہے۔ آہٹ ہونے پر پیچھے مڑ کر دیکھو تو لگے جیسے کوئی وفادار کتا چلا آرہا ہو۔ سر جھکائے آہستہ آہستہ... لیکن جیسے ہی موقع آتا ہے تو ذرا نگاہ بچی اور... اور یہ اوپر لپکا۔"

اتنا کہنے کے بعد خود امی نے محسوس کیا کہ ان کی آواز کچھ اجنبی سی ہو گئی ہے۔ منو بھیا نے محسوس کیا کہ باقی لوگ خاموش ہو گئے ہیں لیکن جاگ رہے ہیں۔

"امی-- اس سے بچنے کی کوئی ترکیب ہوتی ہے؟" منو بھیا نے ہولے سے پوچھا۔

"اس سے بچنے کے لئے بس احتیاط سب سے بڑی شرط ہوتی ہے بیٹا۔ رات گئے دیر تک باہر نہیں رہنا چاہیئے۔ اگر کسی جھاڑی کی طرف جانا ہو تو بچاؤ کے لئے کوئی دھار دار ہتھیار ہونا چاہیئے۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ.... اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ اندھیرا یا دھندلکا ہو تو کسی کتے جیسی چیز کو کتا نہیں سمجھنا چاہیئے۔"

سب نے بستروں میں لیٹے لیٹے اپنے بدن سکوڑ لئے اور سانس روک کر امی کی بات

پر غور کیا۔

"دھندلکے میں کسی کتے جیسی چیز کو کتا نہیں سمجھنا چاہئے.....
... تم اس کا مقابلہ کرکٹ کے بلے اور ماچس سے کرنا چاہتے ہو..... بیوقوف کہیں کے
---ایک معصوم بچے نے ایک دفعہ ایسا ہی کیا تھا۔ جب لکڑ بگھا آیا تو وہ بچہ کچھ نہ کر سکا۔ اس نے بچے کو دبوچا اور گردن چیر کر سارا خون پی لیا۔ اور پنجے گاڑ کر آنتیں نکال لیں اور۔ .... تمام گوشت ادھیڑ ادھیڑ کر کھا لیا۔"

"امی... امی..."۔ منو بھیا نے ان کی کمر مضبوطی سے پکڑ لی۔

"ڈرو مت۔ میں تمہیں سارے خطرات سے آگاہ کرنا چاہتی ہوں تاکہ کبھی دھوکہ نہ اٹھاؤ۔" امی نے بھاری آواز میں کہا۔

کھڑکیوں کے شیشوں کے باہر کہرا دھوئیں کی طرح سلگ رہا تھا۔ ہوائیں رات کی تاریکیوں سے کچھ کہتی ہوئی گزر گئیں۔ اندر حبس زدہ کمرے میں پڑے ہوئے سب لوگ امی کو سنتے رہے۔ امی نے اسی آواز میں کہا۔

"بیٹا! تمہیں اتنی تفصیل سے اس لئے بتا رہی ہوں کہ یہ لکڑ بگھا جو ہوتا ہے نا یہ شیر کی طرح بہادر تو ہوتا نہیں کہ سامنے سے حملہ کرے۔ نہایت کمینہ جانور ہوتا ہے۔ ہمیشہ پیچھے سے لپٹ پڑتا ہے۔ یہ جانتا ہے کہ لوگ اسے کتا سمجھیں گے اسی لئے دھوکے ہی دھوکے میں بالکل قریب پہنچ جاتا ہے اور چپ چاپ موقعے کا انتظار کرتا ہے بس ذرا آنکھ بچی.... بس ذرا آنکھ بچی.... اور.... اور...."۔

سب کے دل کی دھڑکنیں کمرے میں گونجنے لگیں۔

"بس ایک پہچان ہوتی ہے۔" امی نے کہنا شروع کیا۔

"ہاں بس ایک پہچان ہوتی ہے۔ جب یہ چلتا ہے تو چٹ چٹ کی آوازیں آتی ہیں۔ لیکن لوگ باگ یہ آوازیں اپنی چال کے شور میں سن نہیں پاتے۔ اس لئے ضروری ہے کہ راستے میں جب تم دیکھو کہ کوئی چیز تمہارے پیچھے چپ چاپ لگی ہے اور کتے کی طرح معصوم اور وفادار بنی پیچھے چلی آ رہی ہے تو اس وقت.... رک کر غور سے سنو کہ اس کے پیروں سے

چٹ چٹ کی آوازیں تو نہیں آرہی ہیں۔ لیکن منو بیٹے لوگ خود اپنی چال کے شور میں یہ آوازیں سن ہی نہیں پاتے۔ اور....."۔

پاپا، بھائی جان، بڑی آپی، چھوٹی آپی سب کو اپنی سانسیں سینے میں گھٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ سب کو بہت واضح انداز میں محسوس ہوا کہ جیسے باہر ابھی ابھی چٹ چٹ کی آواز ہوئی ہو۔

"امی۔۔ ہمیں لکڑ بگھاد کھائے گا۔"؟

منو بھیا نے غنودہ ہوتے ہوئے فرمائش کی تھی۔ "ہاں..... ہاں۔۔ اب کے لکھنؤ چلیں گے تو چڑیا گھر میں دیکھ لینا۔ اب سو جاؤ بیٹے رات بہت بیت گئی ہے۔"

امی خاموش ہو گئی تھیں۔ منو بھیا سو چکے تھے لیکن سب کے کانوں میں امی کی آواز ابھی تک گونج رہی تھی۔

دھندلکے میں بالکل کتے جیسا نظر آتا ہے..... وفادار بنا ہوا مکار پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ بالکل قریب آجاتا ہے خبر بھی نہیں ہوتی کہ وہ آگیا اور پھر ذرا موقعہ ملا..... اور یہ جھپٹا۔ بڑا حاسد اور چالاک ہوتا ہے..... بہت چالاک..... کبھی سامنے سے حملہ نہیں کرتا۔

بس خود کو وفادار کتا ظاہر کرتا ہوا بالکل قریب آجاتا ہے..... بالکل قریب..... بالکل قریب..... بس ذرا موقع ملا اور جھپٹا.....

سب جاگنے والے مدھم نیلی تاریکی میں آنکھیں کھولے سوچ رہے تھے کہ وہ ہوں ہاں کرنا کیوں بھول گئے ہیں؟ گھٹی ہوئی فضا میں سب یہی سوچتے رہے کہ اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے کمرہ روشن ہو گیا ہو۔ تبھی بڑی آپی کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ انہیں لگا جیسے ان پر ابھی ابھی انکشاف ہوا ہو کہ سب لوگوں کی سراسیمگی اور خوف کا کیا سبب تھا۔ انہوں نے گردن موڑ کر اندازہ کیا کہ منو بھیا کے علاوہ سب لوگ جاگ رہے ہیں لیکن کوئی ظاہر نہیں کر رہا کہ وہ جاگ رہا ہے۔ نیلی روشنی نے ماحول میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ کھڑکیوں کے پٹ آہستہ آہستہ بج رہے تھے۔

اسی وقت بڑی آپی نے سانس روکے روکے بہت پراسرار انداز میں پوچھا تھا.....

"کیا منو بھیا کو لکڑ بگھاد کھانے کے لئے چڑیا گھر لیجانا ضروری ہے امی؟"

اس وقت سب جاگنے والوں کو احساس ہوا کہ یہی سوال اُن کے ذہنوں میں بھی تھا۔ یہ سوال ذہنوں میں کیوں آیا۔

سبکو اندازہ ہوا کہ یہ سوال تو ذہنوں میں آنا ہی تھا۔ تبھی امی نے بڑی آپی کو سونے کی ہدایت کی تھی اور تبھی سب کے لاشعور میں چٹ چٹ..... چٹ چٹ کی آوازیں گونجنے لگی تھیں یہ آوازیں کھڑکیوں کے باہر سے نہیں آرہی تھیں۔

رات بیتی اور دن کی ہلچل شروع ہوئی اور سب لوگ اپنے اپنے پلنگ سے اُٹھے تو محسوس ہوا کہ رات کی باتیں ابھی تک دماغ پر اسی طرح حاوی ہیں۔ جب سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوئے تو ایک عجیب بات محسوس کی گئی۔ انہیں بار بار ایسا لگتا جیسے کہیں سے ایک پراسرار آواز آرہی ہے۔ چٹ چٹ... چٹ چٹ.. جیسے کہیں قریب میں لکڑ بگھا چل رہا ہو۔ پاپا اور بھائی جان اپنے اپنے کام پر گئے تو انہیں بار بار یہ آواز مختلف مقامات پر سننے کو ملی۔ رات کے سارے واقعات ان کی آنکھوں میں تازہ ہو جاتے۔ کام کرتے کرتے جیسے ہی وہ آواز ذہن میں آتی، ہاتھ روک کر گھبرا کر پیچھے پلٹ پڑتے لیکن پیچھے اپنا کوئی عزیز دوست کھڑا نظر آتا۔ وہ سر جھٹک کر ان آوازوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرنے لگتے۔

وفادار کتے کی طرح پیچھے لگا رہتا ہے.... جہاں موقع ملا..... جھپٹ پڑا.. سامنے سے حملہ نہیں کرتا۔ بڑا حاسد اور مکار جانور ہوتا ہے.....

بڑی آپی اور چھوٹی آپی پڑھنے کے لئے کلاس میں گئیں۔ کلاس کے بعد جب ان کی سہیلیاں ان سے بہت ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں تو اس وقت دونوں نے وہی دہشت ناک پراسرار آواز سنی۔

چٹ چٹ..... چٹ چٹ.....

ہراساں ہو کر انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ کیا کہتیں؟

شام کو گھر میں جب سب لوگ جمع ہوے تو ہر چیز معمول کے مطابق تھی لیکن آج سب نے آپس میں ایک عجیب رشتہ محسوس کیا جیسے جنرل وارڈ میں اپنے ساتھ کے بیماروں کو دیکھ کر ایک ذاتی سا تعلق محسوس ہوتا ہے کہ یہ بھی ہماری طرح معذور ہیں اور ہماری ہی طرح بے بس ہیں لیکن اپنے منھ سے کسی نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے دوسروں کو ذرا سا بھی شبہہ ہوتا کہ دن کس سوچ میں گزرا ہے۔

سب ایک دوسرے سے خود کو چھپا رہے تھے جیسے انسان نہ ہوں کوئی بھید ہوں۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہی چٹ چٹ کی آواز سب کے ذہنوں میں چبھنے لگتی۔

پاپا کے دوست خواجہ صاحب پاپا کو بزنس کے متعلق ایک بہت اہم مشورہ دیکر جا رہے تھے تو اس وقت ڈرائنگ روم کے باہر اندھیرا مسلط ہو چکا تھا۔ اسی وقت پاپا کو محسوس ہوا کہ خواجہ صاحب کے پیروں سے وہی آوازیں آ رہی ہیں۔ جاتے جاتے جب خواجہ صاحب نے مڑ کر پاپا سے یہ کہا کہ اس کام کو ان کے مشورے کے مطابق کرنے میں پاپا کو بہت زیادہ فائدہ ہوگا تو معلوم نہیں کیوں پاپا کو یہ محسوس ہوا کہ خواجہ صاحب کی آنکھیں بالکل سرخ ہو گئی ہیں اور ان سے درندگی ٹپک رہی ہے..... جیسے..... جیسے.....

پاپا نے خود کو بستر پر گرا دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد بھائی جان کے دوست اختر بھائی آ گئے۔ منو بھیا بہت دیر تک ان سے اس بارے میں گفتگو کرتے رہے کہ بڑا چاقو کتنے روپے تک میں آجائے گا۔ پھر بھائی جان نے اشارے سے منو بھیا کو اندر بھیجا اور اختر بھائی کو کسی بات پر مشورہ دینے لگے۔ اختر بھائی بھی بہت دیر تک انہیں کسی بات پر سمجھاتے رہے۔

چھوٹی اپی جو پانی لا رہی تھیں دونوں کی باتیں سن کر رک گئیں۔ اچانک کسی بات پر بھائی جان نے اختر بھائی کے پیچھے کھڑے ہو کر جھک کر ان کے کان کے پاس اپنا منھ لا کر کہا.....

"تم اگر یہ کام شروع کر دو تو تمہارا بہت فائدہ ہے میں اس سلسلے میں تمہارا بھرپور ساتھ دونگا۔ آخر دوست ہی دوست کے کام آتا ہے کیوں ہے نا"

اختر بھائی انکا چہرہ نہیں دیکھ پائے ورنہ دیکھتے کہ بھائی جان کی آنکھیں بہت وحشی ہو گئی تھیں اور ان کی باچھوں سے نکیلے دانت باہر نکل پڑے تھے۔

جب اختر بھائی رخصت ہو گئے اور بھائی جان گھر کے اندر واپس آرہے تھے تو چھوٹی آپی نے چلا کر کہا.....

"لکڑ بگھا.... لکڑ بگھا...."

"کہاں ہے؟" بھائی جان پردہ اٹھا کر اندر آئے اور چھوٹی آپی کو گھور کر دیکھا۔

"معلوم نہیں..... باہر ڈرائنگ روم سے کیا آپ آرہے تھے؟ میں نے ابھی ابھی چٹ چٹ کی آوازیں سنی ہیں۔ کیا وہ آپ کے پیروں سے نکل رہی تھیں؟"

"معلوم نہیں..." بھائی جان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"معلوم نہیں... لیکن خدا جانے کیوں آج اپنے کئی دوستوں کی ٹانگوں سے ایسی ہی آوازیں سنائی دیں۔ ابھی ابھی جب اختر گیا تب بھی معلوم نہیں میرا وہم ہے یا.... یا شاید....."

"بھائی جان! کیا آپ کو بھی... کیا آپ بھی..." چھوٹی آپی سراسیمہ ہو گئی تھیں۔

"چپ رہو... چپ رہو۔ اس موضوع پر بات مت کرو...."

منو بھیا کے ضد کرنے پر پاپا اور بھائی جان نے کئی مرتبہ اٹھکر دروازوں کو دیکھا اور جب سب لوگ سونے کے لئے لیٹ گئے تو منو بھیا کے علاوہ سب نے کچھ سوچا۔ اپنی دنیا کے متعلق سوچا۔ اپنے دوستوں کے متعلق سوچا۔ اپنے گرد پھیلے ہزاروں افراد کے متعلق سوچا۔ اور پھر... اپنے متعلق سوچا...

کھڑکیوں کے باہر سرد ہواؤں کے بھاری بھاری جھونکے سائیں سائیں کی لے پر بہہ رہے تھے۔ سائیں سائیں کی ان آوازوں کی مٹڈلی کے ساتھ سب کے ذہن اپنے اور دوسروں کے عمل کا احاطہ کرتے ہوئے جب دور تک چلے گئے اور سب کو اپنی اپنی وہ باتیں بھی یاد آگئیں جو ماضی کے اجاڑ کھنڈروں کے بلوں میں ناگنوں کی طرح چھپ گئی تھیں تو انہیں اپنے نرخرے پر کوئی چیز رینگتی ہوئی محسوس ہوئی اپنے آپ سے بے یقینی کی اس کیفیت

میں انہوں نے دیکھا کہ کھڑکیوں کے باہر کہرے سے پرے دور دور تک ایک جنگل پھیلا ہوا ہے جس میں کتوں جیسے بہت سے جانور ادھر اُدھر گھوم رہے ہیں۔ منو بھیا نے سوتے میں بہت زور سے پہلو بدلا اور ان کی آواز سے سب کمرے کے اندر واپس آ گئے۔ سب کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔ انہیں ایسا لگا جیسے دیوار پر ٹنگے کلاک نے ابھی ابھی بولنا شروع کیا ہے۔ ٹک ٹک.... ٹک ٹک....

کلاک کی ٹک ٹک، باہر ہواؤں کے سائیں سائیں کے بہتے ہوئے شور کے نیچے پھیلے ہوئے اس جنگل کی آواز اور سینے سے ٹکراتی ہوئی دل کی دھڑکنیں آپس میں مدغم ہو گئیں اور اس وحشی آواز میں بدل گئیں۔

چٹ چٹ.... چٹ چٹ.... اور سب نے محسوس کیا کہ کھڑکیوں کے باہر بھی ایک جنگل ہے اور کھڑکیوں کے اندر بھی ایک جنگل ہے۔ کمرے کی دیواروں کے بیچ جنگل میں لیٹے لیٹے سب نے پچھلی رات یاد کی.... "کتے کی طرح خاموشی سے پیچھے لگا رہتا ہے...." امی نے کہا تھا۔

"موقع ملتے ہی جھپٹ پڑتا ہے پنجوں سے آنتیں باہر نکال لیتا ہے، گردن پر چڑھ کر خون پی جاتا ہے۔ دانتوں سے گوشت ادھیڑ ڈالتا ہے...." امی نے کہا تھا۔

سب سوچتے رہے... اپنی اپنی زندگی پڑھتے رہے... پڑھتے رہے... سب جاگ رہے تھے اور سب کو معلوم تھا کہ دوسرے بھی جاگ رہے ہیں۔

دور چوکیداروں کی سیٹیاں گونج رہی تھیں اور منحوس رات کھڑکیوں کے باہر سرسرا رہی تھی۔

اور پھر، صبح جب پاپا سب سے پہلے سو کر اُٹھے تو ایک عجیب سی بات ہوئی۔ انہیں ایسا لگا جیسے ان کی ٹانگوں سے چٹ چٹ کی آوازیں آ رہی ہیں۔ وہ ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے۔ چلے تو وہی آواز پھر سنائی دی۔ رک کر انہوں نے امی کی طرف دیکھا جو کھڑی ہوئی اپنے پیروں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ "کیا تمہیں بھی...؟" پاپا کے منہ سے بس اتنا ہی نکلا۔ "ہاں...." امی نے ان کی طرف دیکھ کر روہانسی آواز میں جواب دیا۔ پاپا نے انہیں بہت غور سے دیکھا اور

وہ دونوں ایک دوسرے کو دیر تک دیکھتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد بڑی آپی نے سہمے سہمے لہجے میں آکر امّی کو بتایا کہ انہیں اپنی ٹانگوں سے چٹ چٹ کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ امّی نے پاپا کی طرف بے بس نظروں سے دیکھا اور بڑی آپی کو دلاسہ دیا.....

" بیٹی یہ تمہارا وہم ہے، اصل میں بات یہ ہے کہ منّو بھیا کی وجہ سے کل سے ہمارے دماغ پر لکڑ بگھا سوار ہو گیا ہے... اور کوئی بات نہیں ہے بیٹی....."

"اور کوئی بات نہیں امّی؟" چھوٹی آپی جو پاس آکر کھڑی ہو گئی تھیں، گھور کر امّی کی طرف دیکھ کر بولیں۔

" ہاں اور کوئی بات نہیں بیٹی۔ اور کوئی بات نہیں....." امّی کے بجائے پاپا نے منہ پھیر کر جواب دیا۔

چھوٹی آپی نے کچھ بتانے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ بھائی جان اپنے بستر سے اُٹھے اور دو قدم چل کر رک گئے اور اپنے پیروں کی طرف یوں دیکھنے لگے جیسے کچھ سننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ پھر چلے، پھر رک کر کچھ سننے کی کوشش کرنے لگے۔ سب نے بھائی جان کی طرف دیکھا اور پھر ایک دوسرے کو دیکھا اور وہ خاموشی سے ان میں آکر مل گئے۔

اتنے میں ملازم باہر سے دوڑتا ہوا اندر آیا اور پھولتی ہوئی سانسوں کے درمیان اس نے اطلاع دی کہ رات پڑوس کے گاؤں میں وہ لکڑ بگھا..... پکڑ لیا گیا اور اب اسے باندھ کر گاؤں والے شہر کی طرف لا رہے ہیں۔ وہ لوگ اب یہاں تھوڑی ہی دیر میں پہنچنے والے ہیں۔

خلاف توقع سب کے چہروں پر حیرت یا خوشی کی علامتیں غائب دیکھ کر وہ سٹپٹا گیا اور واپس چلا گیا۔

سب خاموش کھڑے ایک اور چیز کا انتظار کر رہے تھے۔ ڈرے ڈرے سب انتظار کرتے رہے۔ اور آخر میں جب منّو بھیا جاگے تو وہ انتظار ٹوٹا۔ منّو بھیا لپک کر ان کی طرف بڑھے اور نیند میں ڈوبے ہوئے بے چین لہجے میں پوچھا.....

" آپ لوگ اس طرح کیوں کھڑے ہیں، کیا لکڑ بگھا آیا تھا؟"

"نہیں بیٹے وہ لکڑ بگھا پکڑ لیا گیا۔ اب اس لکڑ بگھے سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

یہ کہہ کر پاپا منو بھیا کو اندر والے کمرے میں لے گئے اور بہت سی نا فیاں دیکر ان سے بہت ڈرتے ڈرتے پوچھا.... "منو بھیا، جب تم چلتے ہو تو تمہاری ٹانگوں سے چٹ چٹ کی آوازیں تو نہیں آتیں.....؟"

منو بھیا حیران سے کھڑے رہے۔ "جلدی بتاؤ..... چٹ چٹ کی آوازیں تو نہیں آتی... ہیں بیٹے جلدی بولو...."

پاپا گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھ رہے تھے۔

"نہیں پاپا.... آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں.. میں کوئی لکڑ بگھا ہوں کیا؟" منو بھیا نے جواب دیا۔

اتنے میں باہر کچھ شور ہوا۔ سب لوگ لپک کر کھڑکی پر کھڑے ہو گئے باہر جھانک کر دیکھا تو.... سینکڑوں دیہاتیوں کی بھیڑ کے درمیان وہ چلا آرہا تھا۔ اس کے منہ پر مسیکا بندھا ہوا تھا اور چاروں ٹانگوں میں زنجیریں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں بالکل سرخ نظر آرہی تھیں اور وہ اندر ہی اندر دانتوں سے چمڑے کے شکنجے کو پھاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جسم پر موٹی موٹی دھاریاں پڑی ہوئی تھیں اور اگلے پنجے خون سے لتھڑے ہوئے تھے۔

معلوم نہیں کیوں پاپا، امی، بھائی جان، بڑی آپی اور چھوٹی آپی سب نے ایک دوسرے کی آنکھ بچا کر اپنے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ دیر تک دیکھتے رہے۔ اب لکڑ بگھا کھڑکی کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اسکی ٹانگوں سے چٹ چٹ کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ پیچھے گاؤں والے لاٹھیاں اور بلم لئے چل رہے تھے اور بھیڑ کے قدموں سے دھول اڑ رہی تھی۔ اچانک کھڑکی کے بالکل سامنے آکر وہ رک گیا۔ چٹ چٹ کی آواز رک گئی۔ اسکے پیچھے چلنے والے لوگ ٹھٹھک گئے۔ دھول آہستہ آہستہ زمین پر بیٹھ گئی۔ کھڑکی سے جھانکتے ہوئے تمام گھر والوں نے سانس روک لیں۔ منو بھیا امی کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ باہر کی بھیڑ ایک دم خاموش ہو گئی۔ لکڑ بگھے نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے تک ایسے ہی دیکھتا رہا۔ پھر اچانک لکڑ بگھا بہت زور سے کھل کھلا کر ہنسا.... لوگ سمجھے شاید

اِعتراف

●

لِکھیں پَڑھیں کچھُو ہُوت نہ کھے تو لِکھ دیوں توہ

صاحبُ البرکات حضرت سیّد شاہ برکتُ اللہ پیمیؔ بلگرامی ثم مارہروی

(ماخوذ از پیم پرکاس)

مسیکا پھاڑنے کی کوشش میں یہ آواز نکلی ہے۔ کسی دیہاتی نے پیچھے سے اس کی کمر پر زور دار لاٹھی کا وار کیا اور نفرت سے بولا..... "سالا کتے جیسا بنکر پاس آجاتا ہے اور داؤں لگتے ہی لپٹ پڑتا ہے..."

لکڑ بگھے نے لاٹھی کھا کر یہ جملہ سنا اور اسکی طرف دیکھا۔ لاٹھی کی ضرب کی شدت سے اس کی آنکھیں پسیج گئی تھیں.....

بھیگی بھیگی آنکھوں سے اس نے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے سب گھر والوں کو باری باری دیکھا۔ اور ایک بار پھر بہت زور سے کھل کھلا کر ہنسا اور چٹ چٹ کرتا بھیڑ کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ لکڑ بگھے کے ساتھ کی بھیڑ ابھی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوئی تھی کہ تھوڑی دیر کے بعد پاپا کھڑکی کے پاس آئے تو ابھی بھیڑ کے قدموں سے اڑی ہوئی دھول فضا میں چھائی ہوئی تھی اور دھول کے پرے منّو بھیا اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ زور زور سے باتیں کرتے اسکول جا رہے تھے۔

پاپا کو محسوس ہوا جیسے ابھی ابھی منّو بھیا کے ہوں اور اپنی ٹانگوں کی طرف دیکھ کر کچھ سننے کی کوشش کی ہو۔ پاپا نے آنکھیں بند کر کے خدا سے دعا کی کہ منّو بھیا اور ان کے ساتھیوں کی ٹانگوں سے کبھی چٹ چٹ کی آوازیں نہ آئیں۔

منّو بھیا اور ان کے ساتھی جب نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو پاپا نے کھڑکی کی سلاخیں پکڑ کر ریلوے لائن کے پار دور دور تک پھیلی ہوئی دنیا کو بہت دیر تک دیکھا اور بہت دیر تک سوچا جب وہ واپس مڑے تو سب گھر والے گردنیں نیچے ڈالے خاموش بیٹھے تھے۔ سب اپنی ذات سے اتنے مایوس اور اداس لگ رہے تھے جیسے کسی وبا کے پھیلنے کی خبر سن لی ہو۔ سب ایک دوسرے کو نیچے ہی نیچے شرمندہ نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ انی نے ایک لمبی سانس لی۔ سب اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر سب کی چٹ چٹ کرتی ہوئی ٹانگیں اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئیں.....

بڑے پُل کی گھنٹیاں

بڑے پل کی گھنٹیاں

بڑے پل پہ گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ نہر کی پٹری پر قافلے ان آوازوں کی طرف کھنچے چلے جا رہے ہیں۔ نہر بہہ رہی ہے۔

سیاہ بادل رات کے آسمان کو تکے جا رہے تھے۔ چاروں طرف گہرے اندھیرے کی چادر تن گئی۔ بادل گرجنے لگے اور بجلی فضا میں اڑانیں بھرنے لگی۔ تھوڑی دیر پہلے تک جو دھندلا دھندلا اپنا سایہ نظر آ رہا تھا، وہ بھی زمین کے گرد و غبار میں کہیں کھو چکا تھا۔

اس نے مڑ کر پلیا کی طرف دیکھا جہاں سے اس نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ جب اس نے اس سفر میں اپنا پہلا قدم اس پلیا سے اٹھایا تھا تو اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ بڑے پل تک اسے اپنی منزل مل جائے گی۔ منزل کا کوئی واضح تصور اس کے ذہن میں نہیں تھا۔ بس یہ معلوم تھا کہ اسکی منزل وہاں ہوگی جہاں کچھ سکون میسر آسکے اور دو گھڑی بیٹھ کر اطمینان سے آرام کر سکے۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ اس چند میل کے ٹکڑے میں اسے کتنی پریشانیاں، کتنے دکھ اٹھانے ہونگے۔ پلیا پر کسی نے اسے آگاہ نہیں کیا تھا کہ نہر کی پٹری کے اس سفر میں اس کے ساتھ اتنی گھاتیں ہوں گی اور اتنے خوف ہوں گے۔ وہ جب چلا تھا اس وقت خوب اجالا تھا اور سامنے بہت دور آسمان کے نیچے اسے اپنے تصور میں نہر کا بڑا پل نظر آ رہا تھا۔ دکھائی کچھ بھی نہیں دیتا تھا کہ اس نہر میں اتنی جگہ موڑ تھے کہ تھوڑی دیر تک اور تھوڑی دور تک تو ہر چیز نظر آتی تھی اور پھر نہر گھوم جاتی اور بڑے بڑے درختوں کی آڑ میں سب کچھ گم ہو جاتا اور صرف قیاس کی بنیاد پر ہر چیز کا اندازہ کرنا پڑتا کہ اگلے موڑ کے بعد کیا ہوگا۔

کئی دفعہ اس کی ہمت ٹوٹی۔ اس نے اپنے دل کو حوصلہ دیا کہ بڑے پل تک بہرحال پہنچنا ہے۔ اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ بڑے پل تک پورے سفر میں کسی سے کوئی مطلب نہیں رکھے گا اور اگر کوئی غرض رکھے گا بھی تو صرف اس قدر کہ اس میں اس کا بھی

کو ئی فائدہ مضمر ہو۔ مسافروں میں اگر کسی کا دامن خاردار جھاڑیوں میں الجھ جاتا تو وہ اس کو کانٹوں سے اس امید پر نجات دلاتا کہ اگر اس کا دامن بھی الجھ گیا تو کو ئی اسکی مدد بھی کر دے گا۔

سفر شروع کرتے وقت اسے راستے کی بابت کو ئی علم نہیں تھا۔ بس ایک موہوم سا خاکہ تھا جو اس نے اپنے ذہن میں بنا لیا تھا۔ کچھ موڑ بھی تھے جن کے متعلق اس نے سوچا تک نہیں تھا لیکن اس نے اپنا سفر جاری رکھا کہ اسے بڑے پل تک پہنچنا تھا جہاں دو گھڑی بیٹھ کر آرام کی سانس لے سکے اور جہاں تھوڑا سکون میسر آسکے۔ حالانکہ راستے میں بھی وہ کئی جگہ تھوڑی تھوڑی دیر بیٹھ کر آرام کر چکا تھا لیکن وہ آرام صرف عارضی تھکن سے چھٹکارا پانے کے لئے تھا اور سفر کا ہی ایک حصہ تھا۔ ہاں..... اصلی سکون تو وہ ہو گا جو نہر کے بڑے پل پر ہے۔

اور پھر جب سیاہ بادل رات کی ہیبت میں اضافہ کرنے لگے اور بجلی ترنگیں بھرنے لگی تو اسے شدت کے ساتھ ایک بھیانک خوف کا احساس ہوا۔ رات پوری طرح کائنات پر حاوی ہو چکی تھی اور قرب و جوار کی ہر شے اپنے چاروں طرف اندھیرا لپیٹے کھو ئی کھو ئی سی لگ رہی تھی۔ جب تک کسی شے پر خوب غور نہ کرتا اور اپنے دماغ اور آنکھوں کی پوری صلاحیتوں سے کام نہ لیتا تب تک کو ئی بھی چیز اپنے اصل وجود کے ساتھ نظر نہ آتی لیکن..... اتنی فرصت کہاں تھی کہ ہر چیز کو دیکھتا اور ہر شے کو سمجھتا۔ اسے تو صرف ایک دھن تھی کہ کسی طرح نہر کے پل تک پہنچ جائے اور اس سلسلے میں اسے اندھیرے میں کئی چیزوں کو غور سے بھی دیکھنا پڑا۔ کئی دفعہ ٹٹول ٹٹول کر بھی احساس کیا اور کئی مرتبہ صرف سوچ کے سہارے اندازہ کیا۔ راستہ بہت تاریک تھا۔ راستے کا اندازہ بھی صرف تبھی ہوتا جب داہنی طرف چھو ٹی چھو ٹی جھاڑیوں کے کانٹے اس کے بدن اور کپڑوں سے الجھنے لگتے یا بائیں طرف زیادہ سرک آنے کی وجہ سے نہر کے پانی کی دھندلی دھندلی سطح نظر آنے لگتی۔ ان دونوں صورتوں میں وہ ذرا ذرا دائیں یا بائیں سرک آتا۔ دونوں طرف خطرہ تھا۔ ایک طرف کانٹوں سے زخمی ہونے کا اور دوسری طرف گہرے پانی کا۔ اور..... آگے بھی خطرہ تھا..... نامعلوم راستے کی پریشانیوں کا۔

اچانک اس نے محسوس کیا کہ تاریکی گہری ہوتی جارہی ہے اور راستہ کٹھن۔ بڑے پل تک پہنچنے کی امید کم ہوتی جارہی تھی اور خوف زیادہ۔ نہر کے اتھاہ پانی کی شرر شرر کی ہیبت ناک آواز اسکے وجود کو کپکپا رہی تھی۔ اس آواز کو دبانے اور خوف کے احساس کو کم کرنے کے لئے اس نے زور زور سے گانا شروع کر دیا۔ اسے لگا جیسے کوئی جھاڑیوں میں بیٹھا وہی گانا گا رہا ہے۔ وہ ایک دم چپ ہو گیا۔ اچانک خاموشی چھا جانے کی وجہ سے پانی کی مدھم لیکن دل سے ٹکرانے والی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی اور اسے ایسا لگا جیسے اس کا دل بیٹھ گیا ہو۔ درختوں کی سائیں سائیں، بادلوں کی گرج اور خود اپنی سانسوں کی تیز تیز آواز پر اور ہر آواز پر اسے نہر کے پانی کی آواز حاوی نظر آئی۔ اسے اپنی سانسیں گھٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ کہیں اس کی سانس نہ رک جائے اس خوف سے اس کی چیخ نکل پڑی۔ درخت پر بیٹھا کوئی اُلّو زور زور سے اپنی شیطانی آواز میں بولنے لگا۔ اور وہ وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔ اس کا دل سینے کی دیواروں پر ٹکریں کھا رہا تھا۔ ایسا اس نے واضح طور سے محسوس کیا۔ آگے کے درختوں پر ایک اور طائر جواباً بلند آواز میں چلّا رہا تھا۔ نہر کے پانی کی شرر شرر، طائروں کی آواز اور اپنی چیخ کی بازگشت فضا میں بہت دیر تک گونجتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اور جب یہ بازگشت اس کی سماعت کی گرفت سے نکل کر آگے کے درختوں میں پہنچ کر سرگوشیاں کرنے لگی تو اسے ایسا لگا جیسے راستے میں بیٹھی چڑیلیں اس کا استقبال کر رہی ہوں یا اس کے آنے کی خوشی میں وحشیانہ انداز میں ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہی ہوں۔ لیکن پل تک پہنچنا ہے، یہ سوچ کر اس کے کانپتے ہوئے قدم آگے بڑھتے رہے۔

نہر کے کنارے کھڑے درختوں کے سائے نہر کے پانی میں اسے قطار باندھے مکار بھوتوں کی طرح لگ رہے تھے جیسے ابھی ابھی سب کے سب پانی سے نکل کر اسے دبوچ لیں گے۔ اچانک اسے ایسا محسوس ہوا جیسے نہر کے کنارے اس کی طرف پھیل رہے ہوں تاکہ گہرے پانی میں اسے غرق کر دیں۔ وہ سہم کر دائیں طرف سرک گیا۔ جھاڑی میں بڑے زور کی سرسراہٹ ہوئی اور کوئی لجلجی سی موٹی سی چنر رسی کی طرح اس کی ٹانگوں میں لپٹ گئی۔ اس نے گھبرا کر اسے ٹانگوں سے کھولا۔ خوف کی شدت سے سارے جذبے ایک دوسرے میں گڈمڈ

ہو گئے تھے اور اسی کیفیت میں اس نے اس چیز کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور تھوڑی دیر بعد جب سرسراتی ہوا نے اس کا پسینہ سکھایا تو اسے احساس ہوا کہ اس نے اپنے ہاتھوں سے ابھی ابھی ایک کالا زہریلا ناگ مارا ہے۔ اس احساس کے ساتھ اس کا دل زور سے دھڑک اٹھا اور اپنے غیر محفوظ ہونے کے خوف سے اس کا رواں رواں کانپ اٹھا۔ لیکن اپنے ایک دشمن کو ختم کرنے کی فتح کے جذبے نے اس کے جسم کے ارتعاش کو تھوڑا کم کر دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد نہر کے پانی کی آواز کی ہیبت اسے پھر محسوس ہونے لگی۔ لگا کہ نہر کا پانی اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ "کیا میں پل تک نہیں پہنچ پاؤں گا؟ ...... کیا آدھے راستے میں ہی نہر مجھے غرق کر دے گی؟" پیچھے سے کوئی الّو چلایا۔ آگے درختوں پر بیٹھے کئی پرندے ایک ساتھ بول پڑے اور اسے لگا جیسے آگے پیچھے ہر طرف ڈائنیں کھڑی اس کے خلاف سازش کر رہی ہیں۔ ہر خوف کو نظر انداز کر کے وہ چلا ہی تھا کہ اسے محسوس ہوا جیسے اوپر درختوں پر کوئی سرگوشیاں کر رہا ہے۔ اس کا جسم کانپ اٹھا۔ اسی وقت بادل زور سے گرجے اور بجلی تڑپ کر نہر کے پانی میں زاویے بناتی چلی گئی۔ اسے لگا جیسے درختوں سے کچھ منحوس ہیولے اتر کر نہر کے پانی میں روپوش ہو گئے ہیں۔ ان درختوں پر اسے پھر سرگوشیاں سنائی دیں۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ درخت کی کسی موٹی سی شاخ پر بیٹھا ایک بوڑھا گدھ اسے مکار نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ پیچھے سے کوئی پرندہ اپنی کریہہ آواز میں چلایا جیسے کہہ رہا ہو......

"پیچھو...... آ رہا ہے...... جانے نہ دیجیو......"

نہر کے پانی میں مزید گمبھیرتا آ گئی تھی۔ وہ سامنے کی طرف ایک ٹک دیکھتا ہوا آگے کی طرف بڑھتا رہا۔ اسے لگا اگر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو جھاڑیوں میں چھپے درختوں پہ دبکے اور نہر کے پانی میں غوطہ لگائے ہوئے کچھ نامعلوم وجود ابھی ابھی نکل کر اسے دبوچ لیں گے۔ ابھی ابھی دبوچ لیں گے......

اور اب وہ نہر کے جس موڑ پر کھڑا تھا وہاں سے اسے بڑے پل کے مدھم خطوط اندھیرے میں گھلے ملے درختوں کے جھنڈ سے ذرا پرے صاف نظر آ رہے تھے۔

"ان بوڑھے درختوں میں ہی اب خطرہ ہے، پھر تو پل صاف نظر آرہا ہے" اس نے سوچا۔

اسے بہت سے لوگ درختوں کے جھنڈ میں دکھائی دیئے۔ سب اسی کی طرح پریشان تھے۔ سب اسی کی طرح نڈھال تھے اور سب اسی کی طرح آگے بڑھتے چلے جارہے تھے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کچھ لوگ اندھیرے میں آگے بڑھتے چلے آرہے تھے۔ سفر کی الجھنوں میں وہ سب کو بھول گیا تھا۔ ہاں.... جب سفر کٹھن ہو تو ہمسفروں کی تکلیف کا احساس نہیں ہوتا۔ لیکن اب وہ راستے کا بڑا حصہ طے کرچکا تھا اور اب اس کے ذہن میں اتنے جذبوں کا اختلاط نہیں تھا کہ ان لوگوں کی موجودگی کا احساس بھی اس کے ذہن میں جگہ نہ پاسکے۔

اس نے آگے دیکھا..... "کیا میں درختوں کے اس جھنڈ کو پار کرسکوں گا؟" اس نے دل میں سوچا۔

ہر درخت اسے دیوزادوں کی طرح کھڑا اسی کا انتظار کرتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔ پسینے سے اس کا جسم شرابور ہوچکا تھا۔ کچھ پرندے اس کے پیچھے چلائے اور ہزاروں اندیشے اس کے کانوں کے پاس پھڑپھڑائے۔ وہ سر جھکائے مرجھائے ہوئے سوکھے سوکھے ہونٹوں کو دانتوں میں دبائے درختوں کے سائے میں داخل ہوگیا۔ درختوں کے سائے میں داخل ہوتے ہی اسے لگا جیسے پیچھے کا پورا سفر ارادوں اور ہمتوں سے بھرپور تھا اور چھوٹے موٹے خطروں سے ٹکرانے کا جذبہ تھا۔ اور آگے بڑھنے کے خوف کی میٹھی میٹھی ترنگیں تھیں۔ اور.... ان بوڑھے درختوں کے جھنڈ میں پہنچ کر جیسے اب ہر جذبہ مردہ ہوچکا ہو کیونکہ نہر کے بڑے پل کے خطوط صاف نظر آرہے تھے اور منزل کا تعین ہوچکا تھا۔

"اب کتنے ہی خطرات کا مقابلہ کرنا پڑے اور کیسے ہی خوف سامنے آئیں، میں وہاں تک ضرور پہنچ سکتا ہوں..."

اسی ایک احساس نے اس کے ہر جذبے پر برف کی سل رکھدی۔ اور سفر میں گزری ہوئی ہر بات کی یاد ہی اس کا واحد سرمایہ بن کر رہ گئی۔ نہر کے پانی کی گمبھیرتا اب بھی ویسی ہی تھی لیکن اس میں شامل خوف کی صدائیں کہیں پیچھے چھوٹ گئی تھیں۔ سب سے بے نیاز ہر چیز سے لاپرواہ مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا وہ درختوں کے جھنڈ سے باہر نکل آیا۔

"اب تو صرف نہر کے پل تک کسی طرح پہنچ جاؤں..." یہی ایک مجبور خواہش اس کے دل میں باقی رہ گئی تھی۔ "کاش ایک بار پھر وہ کپکپاہٹ میری ٹانگوں میں پیدا ہو سکے جو خوف کے باعث اور منزل تک پہنچنے کی جستجو کے جوش میں سفر بھر میرے بدن میں ایک ارتعاش پیدا کرتی رہی ہے ....." اس نے تمنا کی۔

لیکن اب اس کی ٹانگوں میں وہ بیٹھا بیٹھا ارتعاش کبھی نہیں پیدا ہو گا۔ اب اس کے دل میں خوف، جوش اور امیدیں کبھی جنم نہیں لیں گی۔ اب تو تھکن..... صرف تھکن اس کا مقدر بن چکی ہے۔

چہرے پر تھکن سجائے ہوئے شکستہ قدموں سے وہ پل کے اوپر چڑھ گیا۔ اس نے دیکھا پل پر ایک آدمی خاموش بیٹھا پانی کی طرف غور سے دیکھ رہا ہے۔ نہر کی آواز اُسے بالکل اپنی سانسوں کے پاس سنائی دے رہی تھی۔

"وہ لوگ کہاں گئے جو مجھ سے پہلے یہاں آئے تھے؟" اس نے آدمی سے پوچھا۔ اس آدمی نے ہاتھ سے نہر کی طرف اشارہ کیا۔ "کیوں..... ایسا کیوں.. کیا اسی لیے اتنا سفر کیا تھا؟" وہ حیران رہ گیا۔

"ہاں"..... اس نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا..... "اس نہر کے ٹھنڈے اور شفاف پانی میں ہی ہماری منزلیں ہیں.... یہ نہر..... جو راستے بھر ہمیں اپنی آواز سے خوف زدہ رکھتی ہے، ہمیں ایک انجانے خوف میں مبتلا رکھتی ہے۔ اس پل پر آکر ہر خوف کو اپنی گود میں چھپا لیتی ہے اور ہمیں پر سکون اور مطمئن کر دیتی ہے۔"

"کیا اس پل کے بعد یہ نہر ختم ہو جاتی ہے؟" اس نے اس آدمی سے سوال کیا۔

"نہر کبھی بھلا کہیں ختم ہوتی ہے۔ لیکن پل کے ادھر پانی کیسا ہے مجھ سے اگلوں نے بھی اس سوال کا جواب صاف صاف نہیں دیا تھا لیکن اب معلوم ہو جائے گا کہ اب مجھے گھنٹیوں کی آواز سنائی دے رہی ہے۔"

اس آدمی نے یگانگت کے بے پناہ احساس کے ساتھ دھیمے سے مسکرا کر کہا، اور پانی میں کود پڑا۔ پانی بہت زور سے اچھلا۔ تھوڑی دیر تک بھونچال کی سی کیفیت رہی اور پھر وہی

خاموشی اور نہر کی آواز کا سناٹا۔

تھوڑی دیر تک وہ بے حس و حرکت کھڑا رہا پھر اس نے سوچا کہ اس سفر کا حاصل کیا نکلا۔ کیا یہ تکان جو نس نس میں، جوڑ جوڑ میں سرایت کر گئی ہے؟ کیا یہ خوف جو نہر میں کودنے کے خیال سے ہی مجھے محسوس ہو رہا ہے؟

"نہیں" اسے خیال آیا اس کے علاوہ بھی میں نے بہت کچھ پایا ہے۔

سر اٹھا کر اس نے پیچھے کی طرف دیکھا، کچھ لوگ چلتے چلے آ رہے تھے اور درختوں کے جھنڈ کے پیچھے اسے وہ پلیا بالکل واضح طور سے نظر آئی جہاں سے اس نے سفر شروع کیا تھا۔ سویرا ہلکے ہلکے کائنات پر چھا رہا تھا۔ راستے کے تمام پیچ و خم اسے صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ جگہ جہاں اس نے سانپ مارا تھا۔ وہ جھاڑیاں جن میں اس کا دامن الجھ گیا تھا۔ وہ مقام جہاں اسے نہر میں غرق ہونے کا خطرہ لاحق ہوا تھا۔ ہر چیز اب بالکل واضح تھی۔

"میں نے بہت کچھ پایا....." اس نے حساب لگایا..." کیا یہ سب کم ہے، کانٹوں سے دامن چھڑانے کی مسرت۔ بڑے پل تک پہنچنے کی جستجو کا نشہ۔ میٹھے میٹھے خوف جن کی راگنیاں ابھی تک کانوں میں بج رہی ہیں۔ اور کچھ تکلیفیں بھی۔ اور کچھ صرف اپنے تصورات کی بنیاد پر کھڑی بے وجود پریشانیاں بھی.. اور پھر..... یہ کیا کم ہے کہ بڑے پل تک صحیح سلامت پہنچ گیا ہوں۔

اس نے محسوس کیا کہ تھکن پورے وجود کو پیسے ڈال رہی ہے۔ اچانک پیچھے سے کسی نے اسے پکار کر پوچھا....." جو ہم سے پہلے یہاں آئے تھے وہ کہاں گئے بھائی...؟"

اس نے دھیمے سے مسکرا کر اسے دیکھا ہاتھ سے نہر کی طرف اشارہ کیا اور نہر کے صاف و شفاف ٹھنڈے پانی میں کود پڑا کہ ابھی ابھی نہر کے پانی کے جل ترنگ میں بلاوے کی گھنٹیوں کی آواز اسے سنائی دی تھی۔

پانی زور سے اچھلا۔ تھوڑی دیر تک بھونچال کی سی کیفیت رہی اور پھر وہی خاموشی اور پانی کی آواز کا سناٹا۔ اور وہ آدمی، جس نے ابھی ابھی سوال کیا تھا سوچنے لگا کہ کیا اسی لئے اتنا سفر کیا تھا۔

تھوڑی دیر تک وہ آدمی بھی اپنے کھونے اور پانے کا حساب لگائے گا۔ مڑ کر پورے راستے کو دیکھے گا۔ پانی کے جل ترنگ میں بلاوے کی گھنٹیوں کی آواز صاف سنے گا اور پھر اس پورے سفر کی تکان اتارنے کے لئے نہر کے ٹھنڈے، شفاف اور گہرے پانیوں میں کود پڑے گا۔

بڑے پل پر گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ قافلے ان آوازوں کی طرف کھنچے چلے آ رہے ہیں۔

نہر بہہ رہی ہے۔

انتساب

امّی، پاپا
اور ان کی بہو نشاط
کے نام

کعبے کا ہرن

کعبے کا ہرن

امام مصلّے پر بیٹھا۔ مکبر نے تکبیر شروع کی۔

اللہ اکبر اللہ اکبر

تکبیر کا آہنگ آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا۔

حیی علی الصلوٰہ۔ حیی علی الصلوٰہ۔

نمازی، جو دوزانو بیٹھے تھے اٹھ کھڑے ہوئے۔ امیر میاں بھی اُٹھے۔ اُٹھتے اُٹھتے انھیں خیال آیا کہ ابھی تو اس نماز کے بعد ایک اور نماز بھی پڑھنا ہے۔ اُس نماز کا دھیان آتے ہی انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے ان کے چہرے پر ایک دم بہت سے بال اُگ آئے ہوں۔ صف کی ایڑیوں سے ایڑیاں ملانے کے لئے انھوں نے نیچے دیکھا تو جھرجھری آ گئی۔ ریشم کا کمربند پاجامے سے نکلا ہوا تھا اور پنڈلیوں کو چھو رہا تھا۔

کیا میں کمربند اندر کر لوں؟..... انھوں نے سوچا...

امام نے اللہ اکبر کہہ کر نیت باندھ لی۔ امیر میاں نے نیت باندھنے سے قبل ہی "سبحٰنک اللھمّ..... یاد کرنے کی کوشش کی حالانکہ وہ نیت کے بعد پڑھا جاتا ہے۔

امیر میاں نے سوچا کہ وہ سب کچھ دماغ سے محو ہو جائے جسے یاد کر کے انھیں ابھی جھرجھری سی آئی تھی۔ انھوں نے ایک لمحہ کو آنکھیں بند کر کے "سبحٰنک اللھمّ ..... " یاد کرنے کی کوشش کی.... اور آنکھیں بند کرتے ہی اسی لمحے میں انھوں نے کل صبح سے لے کر آج صبح تک کے سارے منظر دیکھ لئے۔

"ندائے ملت" کی آخری سطریں پڑھ کر انھوں نے اخبار گھٹنوں پر رکھ لیا۔ عینک اتار کر آنکھوں کا پانی کرتے کی آستینوں سے پونچھا۔ فضا میں ایک شکرہ ایک چھوٹی سی چڑیا کو دبوچنے کی فکر کر رہا تھا۔

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

یہی حال آج اپنی قوم کا ہے۔ عینک کو ناک پر اچھی طرح جما کر انھوں نے قوم کی بدحالی کے متعلق سوچا۔

اگر سوچتے نہیں تو آج دوستوں میں گفتگو کیا کرتے اور اگر گفتگو نہیں کرتے تو وہ ساکھ کیسے قائم رہتی جو زمینداری ختم ہوجانے کے بعد انھوں نے شہر میں آکر جمائی تھی۔ اس لئے وہ سوچ رہے تھے اور آج ہی نہیں وہ روز سوچتے ہیں۔ ۲۵ سال سے سوچ رہے ہیں اور روزانہ اپنے دوستوں میں بیٹھ کر اپنے اسی سوچنے کی داد لیتے ہیں۔ باہری کمرے میں جسے انھوں نے دیوان خانے کا نام دے رکھا ہے، بیٹھ کر جب وہ حقے کے دُھویں کے ساتھ کوئی زبردست نکتہ بیان کرتے ہیں اور دوستوں کی داد سمیٹتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے بے تاج بادشاہ وہی ہیں اور اس وقت اُنھیں ایسا لگتا ہے جیسے شرعی داڑھی والے بہت سے نورانی چہرے ان کی آواز پر لبیک کہہ رہے ہیں۔

امیر میاں بہت ہوشیار آدمی تھے۔ زمینداری کے زمانے میں وہ دنیا کی تمام اونچ نیچ دیکھ چکے تھے۔ وہ زمانہ سازی کے فن جانتے تھے۔ اگر اس فن سے ناواقف ہوتے تو شاید زمینداری ختم ہوجانے کے بعد گاؤں چھوڑ کر شہر سے جوجھنے نہ آتے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر باقی زندگی گاؤں میں بسر کی تو ان کے لڑکے بڑے ہوکر یا تو مرغ بازی کریں گے یا گاؤں کی لڑکیوں کو چھیڑیں گے۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی سوچا کہ ابھی تو سیر کی آمدنی آتی ہے لیکن جب یہ لڑکے بڑے ہوں گے تو یہی آمدنی چار جگہ تقسیم ہوجائے گی اور سب کے حصہ میں دھیلہ دھیلہ آئے گا۔ اور تبھی انھوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ شہر جاکر بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلائیں گے۔ شہر جانے کا دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ سیاست پر اچھی نظر رہے گی جس کا انھیں شروع ہی سے شوق تھا اور ۱۹۳۷ء میں اسی شوق کی بدولت انھوں نے اپنے حسب توفیق خوب نقصان بھی اٹھایا تھا۔ شہر میں آکر انھوں نے مکان بھی مسلمانوں کے گھروں کے درمیان لیا تھا۔ حالانکہ محلہ ہندوؤں کا تھا لیکن ان کے مکان کی تمام دیواریں مسلمانوں کے مکانوں کی دیواروں سے ملی ہوئی تھیں۔ اسی سے بڑی تقویت رہتی تھی۔

آج بھی وہ حسب معمول اخبار پڑھ کر گفتگو کرنے کے لئے تانے بانے سلجھا رہے تھے

کر چھوٹے لڑکے نے آکر کہا۔

"ابا..... لوگ باہر آپ کا انتظار کر رہے ہیں"۔

"اچھا بیٹا..... کہدو آتے ہیں۔ آج کالج نہیں جاؤ گے؟"

جی ہاں کالج ہی جا رہا ہوں۔"

باورچی خانے کی طرف منھ کر کے انھوں نے حسب معمول بیگم سے چائے اور حقے کے لئے کہا۔ اور شیروانی چڑھا کر، ٹوپی لگا کر باہر کمرے میں آگئے۔ کمرے میں بیٹھے تمام لوگ تعظیم کے لئے مونڈھوں اور کرسیوں پر ایک ایک مٹھی اوپر اٹھے اور سلاموں کا تبادلہ کرتے ہوئے بیٹھ گئے۔ چائے اور حقہ آگیا۔ چائے کی چسکیوں اور حقے کی گڑ گڑ میں باتیں پھدکنے لگیں۔ اسلامیہ مکتب کے چندے کی باتیں، چوک والی مسجد کی مرمت کی باتیں، انجمن ترقی قوم کی تشکیل کی باتیں.....

دروازہ کھلا اور ماجد میاں ہڑبڑائے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

"کیا بات ہے ماجد میاں، آپ اتنے پریشان اور سراسیمگی کا شکار کیوں نظر آرہے ہیں۔"

امیر میاں نے اخباری زبان میں ان کا مزاج پوچھا۔

"آپ براہ کرم ایک گلاس پانی پلائیں تو بندہ کچھ عرض کرنے کی ہمت کرے۔"

پانی پی کر ماجد میاں نے رومال سے چہرے کا پسینہ پوچھا اور رومال شیروانی کی اُدھڑی ہوئی جیب میں رکھ کر چہرے کے تیور کو اس طرح سے سجایا کہ کمرے میں بیٹھے ہر فرد کی نگاہ انھیں پر جم گئی۔

"آپ کو کچھ معلوم ہے شیخ صاحب" ماجد میاں نے پر سرار انداز میں ڈرامہ پیدا کیا۔

"کیا..... کوئی خاص بات" امیر میاں نے گردن ترچھی کر کے کچھ اس انداز سے کہا جیسے جو بات انھیں معلوم نہیں ہوگی وہ یقیناً غیر اہم ہوگی۔

"آپ کے پڑوس میں ایک قتل ہو گیا اور آپ بے خبر ہیں" ماجد میاں نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کیا۔

"کیا..... بخدا..... ارے نہیں..... سچ فرمایئے۔ واللہ" حاضرین کی پیالیوں سے

چائے اور منہ سے بے ترتیب جملے ایک ساتھ اُچھلے۔

"جی ہاں جناب عالی..... ابھی ابھی اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آرہا ہوں۔ لاش کی شناخت نہیں ہو سکی ہے لیکن لاش کے ہاتھ میں اسٹیل کا کڑا ہے۔ نوجوان لڑکے کی لاش معلوم ہوتی ہے، میں نے تو دور سے دیکھا۔"

کمرے کی بوجھل فضا میں پھر ماجد میاں کی آواز گونجی۔

"لاش کسی ہندو لڑکے کی معلوم ہوتی ہے، اگر ایسا ہے تو بڑا خطرہ ہے۔ باہر لوگ عجیب عجیب باتیں کر رہے ہیں۔"

"کیا خطرہ..... کیسی باتیں؟" چائے کی پیالیاں ہونٹوں تک آتے آتے رک گئیں۔

"بس یہ سمجھ لیجئے کہ اگر ہندو لڑکے کی لاش ہے تو فساد تیار ہے۔ کیونکہ بالکل آپ کے پڑوس میں اور مسلمانوں کے گھروں کے درمیان قتل ہوا ہے۔"

بہت دیر تک حقّے کے انگارے چٹختے رہے اور چائے ٹھنڈی ہوتی رہی۔ خاموشی کمرے میں چپ چاپ رینگتی رہی۔ اور اسی خاموش اور وحشت ناک ماحول میں سب نے سنا کہ باہر تھوڑی دور پر اسی حادثے کے متعلق باتیں ہو رہی ہیں۔

تبھی امیر میاں نے سوچا، یہی وقت ہے جب میں اپنی شخصیت اور مضبوط کر سکتا ہوں۔

"اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ لاش یقیناً کسی ہندو کی ہی ہوگی۔ خدا نہ کرے کہ اپنی قوم کا کوئی فرد کم ہوا ہو۔ ہم لوگ اب یہاں رہ ہی کتنے گئے ہیں اور جہاں تک فساد کا تعلق ہے جھگڑے سے نہیں ڈرتے۔ ایک ایک دس دس کے لئے کافی ہوگا۔" لیکن امیر میاں نے محسوس کیا کہ یہ کہتے ہوئے ان کا لہجہ بالکل اسی حقّے کی طرح سرد تھا جس کے لاتعداد کش لینے کے باوجود ماجد میاں اب تک اس کی چنگاریوں کو جگا نہیں پائے تھے۔

سب نے محسوس کیا ہر آدمی کے چہرے پر ایک انجانا خوف سلگ رہا ہے۔ امیر میاں نے سوچا جب تک یہ لوگ رہیں گے محفوظ رہوں گا۔ لیکن لوگ آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگے۔ ان میں انھیں روکنے کی ہمت نہیں تھی۔ یہ لوگ کیا سوچیں گے اگر میں انھیں روکوں گا۔ وہ یہی سوچتے رہے۔ جب آخری دوست بھی چلا گیا تو انھوں نے باہری کمرے کا دروازہ

مضبوطی سے بند کیا اور اندر آکر بیوی سے کہا۔

"پچھواڑے والے دروازے میں تالا لگا دو ساری کھڑکیاں گنڈی لگا کر بند کر دو اور لڑکوں کی سلامتی کے واسطے دعائیں مانگو۔ فساد کسی وقت بھی شروع ہو سکتا ہے۔"

اور جب اُنھوں نے بیوی کو مکمل تفصیل بتائی تو بے چاری کھانا پکانا بھول گئیں اور جانماز بچھا کر سجدے میں گر پڑیں۔

شام تک انھوں نے جیسے وقت کاٹا وہ خود ہی محسوس کر سکتے تھے۔ ہر آواز پر انھیں ایسا لگتا تھا جیسے ان کے بیٹوں کو کسی نے کالج سے واپسی میں قتل کر دیا ہو اور کوئی انھیں یہ خبر سنانے بھاگا چلا آرہا ہو۔ دروازے پر دستک ہوئی اور وہ دل سنبھال کر اُٹھے۔ کسی بھی بری خبر کو سننے کیلئے خود کو تیار کیا اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے ان کے چاروں لڑکے کھڑے تھے۔

"ابا... آپ کو معلوم ہے؟".....

"ہاں ہاں۔ تم لوگ اپنی ماں کے پاس جاؤ وہ بہت گھبرا رہی ہیں۔"

اس کا مطلب ابھی لاش کی شناخت نہیں ہوئی ہے۔ ورنہ لڑکے اتنی آسانی سے گھر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اب اتنا وقت نہیں رہا کہ گاؤں واپس جایا جا سکے۔ آخری ریل بھی نکل چکی ہوگی۔

شام اندھیری ہوتی جا رہی تھی اور انھیں ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ سورج اب کبھی نہیں نکلے گا۔ انھوں نے اندازہ لگایا کہ محلے میں ان کے خاندان سمیت سو مسلمان ہوں گے جبکہ ہندوؤں کے گھروں کی تعداد دو سو سے زیادہ ہے۔ ان کے چاروں لڑکے ماں کے پاس بیٹھے انھیں دلاسے دے رہے تھے۔ حالانکہ سب جانتے تھے کہ صورت حال کیا ہے۔ رات پوری طرح امنڈ آئی تھی اور فساد کا خوف مکمل طور سے مسلط ہو چکا تھا۔ آہٹ ہونے پر کئی دفعہ وہ بڑے دروازے کی درازوں سے جھانک کر دیکھ چکے تھے۔ باہر سارے تاریک سائے انھیں فسادی لگ رہے تھے۔ دس پونے دس بجے کے قریب باہر کچھ ہل چل سنائی دی۔ کچھ لوگ گالیاں بکتے، قہقہے لگاتے گزر رہے تھے۔ ان کا دل بہت دیر تک دھڑکتا رہا۔ بڑے بیٹے نے بتایا "لوگ سینما دیکھ کر واپس آرہے ہیں، کوئی خطرے کی بات نہیں۔ آپ گھبرائیں نہیں۔"

"ہاں ہاں۔ ظاہر ہے۔ گھبراتا کون ہے۔ تم لوگ اپنی ماں کے پاس رہو۔ اور دیکھو خبردار جو کوئی کھڑکی یا دروازہ کھولا۔" وہ نہیں چاہتے تھے کہ لڑکوں پر ان کا بھرم ٹوٹ جائے۔ رات بیتی جارہی تھی اور تمام فسادات یاد آرہے تھے۔ تقسیم ہند کا فساد ان کے دماغ میں کچوے کی طرح بلبلا رہا تھا اور اس کے علاوہ ہزاروں چھوٹے بڑے واقعات انھیں یاد آرہے تھے جو ان تک اخباروں اور ریڈیو کے ذریعے پہنچے تھے۔ وہ سب کچھ یاد کرتے رہے اور ان کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے رہے۔ باری باری انھوں نے ایک بار پھر سارے دروازے اور کھڑکیاں دیکھ ڈالیں۔ باہری کھڑکی کی ایک سلاخ نکل گئی تھی اور اتنا بڑا خلا ہو گیا تھا کہ ایک آدمی اس میں سے نکل جائے۔ انھوں نے فوراً چاروں لڑکوں کو بلایا اور ایک چارپائی اس انداز سے کھڑی کر کے لگادی کہ وہ خلا بند ہو گیا۔

ابھی شناخت نہیں ہوئی ہوگی ورنہ اب تک فساد شروع ہو گیا ہوتا۔

انھوں نے دعا مانگی "اے خدا صبح تک شناخت نہ ہو پائے، میں کل ہی بیوی بچوں کو لے کر گاؤں چلا جاؤں گا۔ وہاں میری بہت ضرورت ہے اور جب فساد کی آگ ٹھنڈی ہو جائے گی تو واپس آجاؤں گا۔ میں دو نفل نماز شکرانہ پڑھوں گا اگر لاش ہندو کی نہیں ہوئی تو۔"

کسی نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ سب کے سب ایک پلنگ پر بیٹھے فساد کا انتظار کر رہے تھے فساد کا کیا اپنی موت کا انتظار کر رہے تھے۔ ۱۰۰ مسلمان اور ۲۰۰ ہندو گھروں کا کوئی مقابلہ تھا کیا۔ امیر میاں اتنے سراسیمہ تھے کہ شیروانی اتارنا تک بھول گئے تھے۔ جب بہت گرمی محسوس ہوئی تو بڑی بد سلیقگی سے شیروانی اُتار پھینکدی۔ اسلامیہ مکتب کے چندے کی کاپیاں اور مسجد کی مرمت کے حساب کے پرچے گر پڑے۔ سارے کاغذات زمین پر پڑے ہوا میں کھیلتے رہے۔

یکایک باہری کمرے میں بڑے زور کی آواز آئی۔ سب کے دل کچھ دیر کو دھڑکنا بھول گئے۔ سب ویسے ہی پلنگ پر بیٹھے رہے بُت بنے چپ چاپ۔ ۲۰۰ ہندو گھروں کا کون مقابلہ کرتا۔ لیکن جب ایک بلّی باہری کمرے سے باہر نکلی تو سب خاموش بیٹھے اسے دیکھتے رہے۔ اور چہروں سے شرمندگی پسینہ بن کر ٹپکتی رہی اور امیر میاں دھیان بٹانے کے لئے

فارسی کا وہ شعر بلند آواز میں پڑھنے لگے جس میں بلی کی بے وفائی کا بیان تھا۔

معلوم نہیں کے صدیوں کے بعد صبح ہوئی۔ امیر میاں نے سوچا شاید فسادی صبح ہونے کا ہی انتظار کر رہے تھے۔ ورنہ اب تک شناخت تو ہو چکی ہوگی۔ فسادیوں نے معاملہ صبح پر چھوڑ دیا ہوگا۔ سورج بالکل اسی طرح نکلا جیسے روز نکلتا ہے۔

"آج تم لوگ کالج نہیں جاؤ گے اور نہ کوئی دودھ لینے باہر جائے گا۔ کوئی دروازہ جب تک میں نہ کہوں نہیں کھلے گا سمجھے؟" اور ہاں تم بھی آج آفس مت جانا" انھوں نے بڑے لڑکے کو تنبیہ کی۔

باہر بالکل خاموشی تھی، جیسے کسی حادثے کا پیش خیمہ ہو۔ ۸ بجے کے قریب یکایک دروازے پر بڑے زور کی دستک ہوئی۔ انھوں نے بڑی یاسیت کے ساتھ لڑکوں کی طرف دیکھا اور چاروں کو لے کر دروازے پر پہنچے۔ دروازے پر جا کر بھرائی ہوئی آواز میں انھوں نے پوچھا۔ "کون ہے"؟

"میں ہوں شیخ صاحب۔ دروازہ کھولئے۔"

"ماجد میاں" انھوں نے سرگوشی کے انداز میں بیٹوں کو بتایا۔ ماجد میاں کے بال بچے تو ہیں نہیں۔ انھیں کسی بات کا ڈر نہیں۔ دروازہ کھول کر انھوں نے ماجد میاں کو پھرتی سے اندر کیا اور جلدی سے دروازہ بند کر کے ان کی طرف مڑے۔ مڑتے وقت انھوں نے پوری کوشش کی کہ ماجد میاں پر ان کی دہشت کا اظہار نہ ہو سکے۔ "سب خیریت ہے ماجد میاں؟"

انھیں معلوم تھا کہ ماجد میاں اس وقت ان کے گھر پناہ لینے آئے ہوں گے اور یہ خبر سنانے آئے ہوں گے کہ فسادی اب مشکل سے فرلانگ بھر کے فاصلے پر ہیں۔

"سب خدا کا شکر ہے آپ کی دعا ہے۔ میں گزر رہا تھا سوچا آپ کو اطلاع دیدوں کہ لاش کی شناخت ہو چکی ہے اور وہ لاش مسلمان لڑکے کی ہے۔ کوئی رقابت کا چکر تھا۔ مگر یہ دروازے کیوں بند کر رکھے تھے آپ نے"۔ ماجد میاں نے ایک ساتھ بہت سی باتیں کہہ ڈالیں۔

"کیا بھئی۔ سچ کہیے گا واللہ کسی مسلمان کی لاش تھی؟ یعنی ہندو کی لاش نہیں تھی۔ واہ واہ خوب سنائی آپ نے آکر ..... ارے وہ دروازے کی بھی خوب کہی آپ نے۔ بات یہ ہوئی

کہ آج ہم لوگ بری طرح سوئے، ابھی ابھی جاگے ہیں بس۔ جب آپ آئے، بس یقین کیجئے آپ آئے جبھی جاگے"۔

"ارے بھئی بیگم۔ آج چائے کے ساتھ ذرا حلوا بھی بھیج دینا۔ بھئی ماجد میاں آئے ہیں"۔

اور اس دن وہ اپنے باہر کے کمرے میں جسے انھوں نے دیوان خانہ کا نام دے رکھا تھا بیٹھے اپنے دوستوں سے کہہ رہے تھے۔

"آج اپنی قوم کا ایک فرد اور کم ہو گیا۔ ہم لوگ تعزیتی جلسہ کریں گے اور مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کریں گے"۔

امیر میاں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اب امام "سورۂ فاتحہ" بھی شروع کر چکا تھا۔ امیر میاں نے بہت بے بسی کے ساتھ "سبحنک اللّٰھم ....." یاد کرنے کی کوشش کی لیکن دماغ نے پھر راستہ بدل لیا، انھیں بہت شدت کے ساتھ یاد آیا کہ ابھی اس نماز کے بعد وہ نماز بھی پڑھنا ہے خدا کا شکر ادا کرنا ہے لاش مسلمان کی نکلی۔

نیچے نظر گئی تو ریشم کا کمر بند ویسا کا ویسا ہی پنڈلیوں کو چھوتا ہوا جھول رہا تھا۔ انھیں اپنے چہرے پر پھر بڑے بڑے بال اگتے ہوئے محسوس ہوئے۔ انھیں ایسا لگا جیسے وہ مسجد میں ننگے کھڑے ہیں بالکل ننگے۔

○○

اظہار

نقشِ ظاہر بہرِ نقشِ غائب است
واں برائے غائبِ دیگر بہ بست

مولانا جلال الدین رومی

لکڑ بگھا رویا

لکڑ بگھا رویا

کپتان پولیس سے لکڑ بگھا زندہ پکڑ لانے کے اس کارنامے پر شاباشی اور انعام لینا ہے۔ اس خواہش کے نشے میں وہ ہجوم ایسا بے حواس ہوا کہ یہ بھی نہیں سوچا کہ ان کا بنگلہ آبادی سے پرے جنگل کے راستے میں ہے اور جنگل دیکھ کر اس کی وحشت بھڑک بھی سکتی ہے۔ اور یہی ہوا۔

لکڑ بگھے کو لئے ہوئے وہ ہجوم ابھی پولیس کپتان کے بنگلے کے راستے ہی میں تھا اور بنگلے کی چار دیواری تھوڑی ہی دور رہ گئی تھی۔ تو جانے اسکے اندر کہاں سے اتنی طاقت آ گئی کہ وہ ایک لمحے کو رکا۔ گردن میں پڑی زنجیر کھنچی اور تن کر رہ گئی۔ منہ پر بندھے مسیکے کے اندر غراہٹیں آپس میں گڈمڈ ہونے لگیں۔ تب زنجیر تھامے شخص نے اپنی پوری طاقت سے زور لگایا۔ لکڑ بگھے کے اگلے پنجے زمین سے اٹھے اور پچھلے پنجوں پہ تھما اس کا بدن چند بالشت آگے سرک آیا اور اتنے حصے کی زمین پر اس کے پنجوں کے نشان ایسے بن گئے جیسے کسی نے زمین پر دو لاٹھیاں رکھ کر طاقت سے کھینچ دی ہوں۔

پچھلے پنجوں کو دَم لگا کر روکا۔ اگلے پنجے فضا میں بلند کئے اور پورے بدن کی قوت کو ریڑھ کی ہڈی اور بازوؤں کے جوڑوں میں بھر کر چھلانگ لگادی۔ زنجیر تھامے شخص کی مضبوط گرفت میں پھنسی زنجیر اس کی ہتھیلیوں کو لہولہان کرتی ہاتھ سے نکل گئی۔ ہجوم کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور کچھ بے ترتیب جملے۔ وہ آگے ہی آگے دوڑ رہا تھا اور زنجیر جھنجھناتی ہوئی اس کے ساتھ ساتھ کھسک رہی تھی۔ دیہات سے آنے والی سڑک پر پولیس کی ایک جیپ شور مچاتی ہوئی آ رہی تھی۔ آگے جیپ اور پیچھے اودھم مچاتا ہجوم۔ وہ ایک لمحے کو ٹھٹکا اور کپتان کے بنگلے کے گیٹ پہ کھڑے باوردی سپاہی کی خاکی پتلون سے ٹکرا تا ہوا، گلاب کے تختے کو پار کر کے گردن گردن کھڑے گیہوں کے کھیت میں گھس

کر گم ہو گیا۔

پولیس کپتان نے ڈرائنگ روم سے ملحق اپنے آفس میں بیٹھے بیٹھے دروازے سے باہر برآمدے میں کھڑے اس شخص کو دیکھا جو کرتا پاجامہ پہنے تھا، جس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی، جس کی گردن اور چہرے پر ڈنڈوں کی مار کے تازہ نشان تھے۔ اور جس کے ہونٹوں پر پپڑی جمی ہوئی تھی۔ کندھوں پر رائفل لٹکائے دو سپاہی اسکے بازو پکڑے اسے گھیرے کھڑے تھے۔

سورج ڈوب چکا تھا لیکن روشنی اتنی کم بھی نہیں تھی کہ پولیس کپتان اس شخص کے ماتھے پہ لکھے اندھیرے کو پڑھ نہ سکیں۔ انہوں نے کرسی پر پہلو بدلا۔ حلق میں کوئی چیز اٹکی ہوئی محسوس ہوئی۔ کھنکار کر گلا صاف کیا اور اپنے اور اس آدمی کے درمیان کھڑے تھانہ کنچن گڑھی کے تھانے دار کی وردی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اوپر سے نیچے تک دیکھا اور آواز میں افسرانہ رعب پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہیڈ کانسٹبل رام اوتار کتنی دیر میں آپائے گا۔؟"

تھانے دار کی ایڑیاں آپس میں ملیں، مٹھیاں ٹانگوں سے چپک کر نیچے کی طرف کھنچیں۔ ہونٹوں پر ایک تجربہ کار مسکراہٹ آئی۔

"ڈرائیور سے کہہ دیا تھا سرکار کہ آندھی کی طرح جیپ لے جائے اور طوفان کی طرح واپس لائے۔ دیوان جی تھانے پر نہ ہوں تو گھر سے اٹھا لائے۔ سول پہنے ہوں تو وردی پہننے میں سمے نہ خراب کریں۔ وردی اٹھائے لائیں۔ راستے میں جیپ کے اندر ہی بدل لیں۔ جیپ آتی ہی ہوگی حضور۔"

"ہوں" اور یہ کہہ کر انہوں نے اس شخص کے پیچھے کھیتوں پہ پھیلی تاریکی میں آنکھیں جما دیں۔ اور جب نگاہیں واپس کھینچیں تو دیکھا کہ برآمدے کے نیم تاریک ماحول میں لپٹے اس شخص کا سینہ آہستہ آہستہ ہل رہا تھا اور آنکھوں سے بے آواز آنسو بہہ رہے تھے۔ انہیں پھر حلق میں کوئی چیز اٹکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

دبدھا بھری آواز میں تھانے دار سے پوچھا۔

"کیا آپ کو بالکل یقین ہے کہ یہ نایک کے گروہ کا آدمی ہے؟"

حسب عادت تھانے دار نے بدن کو خفیف سا جھٹکا دیکر خود کو اٹینشن ظاہر کیا اور پہلے سے بھی زیادہ اعتماد کے ساتھ بولا۔

"آپ چنتا نہ کریں حضور۔ بالکل صحیح آدمی مارا جا رہا ہے۔" پھر کچھ رک کر، کچھ سوچ کر بولا، اس بار اس کی آواز میں سرگوشی کے سر نمایاں تھے۔

"اگر چھوڑ دیا گیا تو کل ہی یہ ضمانت کرالے گا اور پرسوں آپ کے پاس علاقے سے وائرلیس میسج آجائے گا کہ فلاں گاؤں میں ڈکیتی پڑ گئی اور تین آدمی مارے گئے اور پھر اوپر سے آئی۔ جی صاحب کی ڈانٹ آئے گی۔ تو سرکار آپ خوب غور کر لیں۔"

اور تب کپتان پولیس نے سوچا کہ کنچن گڑھی کا تھانے دار بالکل سچ کہہ رہا ہے کیوں کہ اگر یہ جھوٹ بھی بول رہا ہے تب بھی اپنی بات کو سچ ثابت کرنے بھر کی طاقت اور صلاحیت اس میں موجود ہے۔ اگر مخبر کی یہ اطلاع صحیح بھی ہے کہ تھانے دار کنچن گڑھی اس ملزم شام سندر کو صرف اس لئے مروانا چاہتا ہے کہ کنچن گڑھی کا پردھان اس کام کے لئے تھانے دار کو پانچ ہزار روپے دے چکا ہے، تب بھی میں کیا کر سکتا ہوں۔ اگر میں ملزم شام سندر کو چھوڑ بھی دوں تو یہ بالکل صحیح ہے کہ کل ہی اس کی ضمانت ہو جائے گی اور پرسوں تھانہ کنچن گڑھی سے دو کوس دور گرام لال پور کے ان تینوں آدمیوں کو تھانے دار مروا ڈالے گا جن کے قتل کے لئے ایم۔ ایل اے شری رام دھر دس ہزار نقد اور تخت تھانے کی تھانے داری دلانے کا وعدہ کر چکے ہیں۔ اور پھر رات کے تین بجے وائرلیس پر تعینات سپاہی میرے کمرے کے اندر جوتے اتار کر آئے گا اور ہاتھ میں تھامی سلپ پڑھے گا۔

"گرام لال پور میں رات دو بج کر پینتالیس منٹ پر ڈکیتی پڑی۔ پولیس ٹھیک سے پر پہونچ گئی۔ ڈاکو سامان نہیں لے جا سکے۔ مڈبھیڑ میں ڈاکوؤں کے ہاتھ گاؤں کے تین آدمی مارے گئے۔ ڈاکو ایک دیسی طمنچہ اور کچھ خالی کارتوس چھوڑ کر بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔"

اور جب یہ میسج ہیڈ کوارٹر پہونچے گا تو آئی۔ جی صاحب کی ڈائری میں پھر میرا نام لکھا

جائے گا اور جون والے تبادلوں میں ہوسکتا ہے کسی بے کار سی پوسٹنگ پر مجھے دے ماریں۔ اور جب بے کار سی پوسٹ ملتی ہے تو نہ اتنا بڑا گھر ہوتا ہے جسمیں سال بھر کا غلہ اگایا جاسکے اور نہ سپاہیوں کی اتنی بڑی فوج اور نہ وہ دبدبہ۔ ساتھ کے افسران چپکے ہی چپکے آنکھوں ہی آنکھوں میں کیسا مذاق اڑاتے ہیں۔

"میرے کہنے کا مطلب یہ تھا" انہوں نے کرسی کی پشت سے پیٹھ لگا کر مطمئن لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "کہ کیا ہیڈ کانسٹبل رام اوتار کو اس کا تجربہ بھی ہے؟"

"حضور!" تھانے دار کی آواز میں بلا کا اعتماد تھا کیونکہ وہ اپنے افسر کی ہار پڑھ چکا تھا۔

"حضور دیوان جی رام اوتار پچھلے کپتان پولیس شری ورما کے سمے میں اکیلے ہی پانچ بار یہ کام کر چکا ہے۔ بہت بکٹ جوان ہے۔"

"مگر کیا یہ مناسب ہوگا کہ ملزم یعنی اس ڈکیت کو ہماری ہی کوٹھی میں مارا جائے۔"

"سرکار۔ اس میں ایک راج نیتی ہے۔ مقدمہ یوں بنے گا کہ ملزم اپنے گروہ کے ساتھ کپتان پولیس کی کوٹھی پر رات کے سمے پہونچا جہاں تھانے دار کنچن گڈھی علاقے کی ڈکیتی اور مرڈر کی چرچا کرنے گئے ہوئے تھے۔ گروہ اس بات کی ٹوہ لینا چاہتا تھا کہ کپتان پولیس نے کیا آدیش دیئے ہیں۔ کیونکہ کپتان صاحب نے پورے علاقے کو کلیر کرنے کے آدیش دیئے تھے۔ اسلئے اچانک کپتان صاحب پر جانی حملہ ہوا۔ ملزمان بھاگے۔ ان کے پیچھے پیچھے تھانے دار کنچن گڈھی اور دیوان رام اوتار بھاگے۔ باقی لوگ اسلحہ اور کچھ خالی کارتوس اور جوتے چھوڑ کر بھاگنے میں سپھل ہوگئے پر نتو حملہ کرنے والے شیام سندر عرف شامو کو دیوان رام اوتار نے مڈبھیڑ میں مار گرایا۔

اتنا کہہ کر تھانے دار رکا۔ کپتان پولیس نے دیکھا کہ اندھیرے میں اسکے دانت چمک رہے تھے۔ جیسے..... "ہوسکتا ہے ڈی۔ آئی۔ جی صاحب ہیڈ کانسٹبل رام اوتار کو اس بہادری کے صلے میں پان سو روپیہ انعام بھی دے دیں۔" اس کے دانت پھر چمکے۔ اس کے دانتوں کی چمک اور ملزم کے چہرے پر پھیلی ہوئی دھندلاہٹ کے پس منظر میں گیہوں کے کھیت بالکل تاریک ہوچکے تھے۔

"کرمچ کے جوتوں اور دیسی کٹے کا انتظام ہو گیا ہے۔؟"

"جی ہاں حضور، سپاہی بلدیو کے پاس تھیلے میں سارا سامان موجود ہے۔"

جیپ نے موڑ کاٹا۔ برآمدے کے پاس آکر بریک لگے اور ہیڈ لائٹس بجھ گئیں۔

پولیس دیوان رام اوتار وردی پہنے اترا۔ کھٹ کھٹ کرتا چلا۔ اور ملزم شام سندر کو ایک نظر دیکھتا ہوا، کپتان پولیس کے سامنے آکر جوتے بجا کر سیلوٹ کر کے اٹینشن کھڑا ہو گیا۔

"آرام سے" کپتان پولیس نے حسب عادت کہا۔

"باہر بڑی بھیڑ ہے۔ دیہات والے لکڑ بگھا پکڑ کر لائے تھے، وہ چھوٹ گیا ہے اور صاحب کی کوٹھی کے اندر ہی ہے۔" رام اوتار نے بدن ڈھیلا چھوڑتے ہوئے کہا۔

"کیا دیوار پھلانگ کر آیا۔؟" کپتان پولیس نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں حضور۔ پہرے کے سپاہی نے بتایا ہے کہ مین گیٹ سے گھسا ہے۔"

"لکڑ بگھے کی ہمت دیکھئے حضور۔ مین گیٹ سے گھس آیا۔" تھانیدار کنچن گڑھی کے دانت پھر چمکے۔

کپتان پولیس کرسی سے آدھے اٹھ چکے تھے۔ اس جملے پر ایک ثانیے کو ٹھٹکے، پھر سیدھے کھڑے ہو کر بولے۔

"میں دیکھتا ہوں۔ بھیڑ کوٹھی کے اندر نہ آجائے۔"

"آپ بیٹھیں سرکار۔ بھیڑ میں خود سنبھالتا ہوں۔" تھانیدار بولا۔

"نہیں"۔ کپتان پولیس نے تقریباً جھڑکنے والے انداز میں اس طرح کہا جیسے افسر کہتے ہیں کیونکہ عہدے اور تجربے نے انہیں اتنا سکھا دیا تھا کہ جس عمل سے کسی کو کوئی مادی نقصان نہ پہونچ رہا ہو اس بارے میں لہجہ کتنا ہی درشت اور کرخت کیوں نہ ہو ماتحت برا نہیں مانتے اور برا مان بھی جائیں تو اس کا کوئی نقصان دہ ردعمل نہیں ہوتا۔ اور پھر ایسے موقعے پر لہجے کو کرخت کرنے سے افسری کی انا کو بھی تسکین ملتی ہے۔

"آپ اس کام کو نبٹائیے۔" انہوں نے ملزم کیطرف دیکھتے ہوئے کہا۔

یہ سن کر ملزم کا بدن کانپنے لگا۔ انہوں نے ملزم کی آنکھوں کی طرف غور سے دیکھا۔ کیونکہ اس کا چہرہ ملگجی روشنی میں تھا اس لیے وہ اس کی آنکھیں نہیں دیکھ سکے۔

وہ ایک جھٹکے کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئے۔ گیٹ پر پہرے کا سپاہی بھیڑ کو روکے کھڑا تھا اور چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔

"چھتا نہ کرو۔ دیوار بہت اونچی ہے۔ نکل نہیں پائے گا۔"

"اس کے ہاتھ باندھ کر کوٹھی کے پیچھے لے چلو۔ دیوان جی! رائفل لوڈ کر لو۔ سپاہی! کھیت کے پاس جا کر اسے دوڑاؤ۔ چھتا نہ کرو دیوار بہت اونچی ہے۔ یہ بھاگ نہیں پائے گا۔"

"میں بہت پرسن ہوں کہ آپ لوگوں نے جی داری سے کام لے کر اس خونی لکڑ بگھے کو زندہ پکڑ لیا۔" کپتان پولیس یہ کہہ کر رکے اور پھاٹک سے لگی بھیڑ پر ایک نظر ڈال کر یہ سوچ کر دل ہی دل میں بہت خوش ہوئے کہ ان کے بولتے ہی بھیڑ ایسے خاموش ہو گئی تھی جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔

"اب آپ لوگ شور نہ کریں۔ باہر ہی باہر دیوار کے سہارے لاٹھیاں لے کر کھڑے ہو جائیے۔ اگر لکڑ بگھا بھاگنے کی کوشش بھی کرے تو اسے باہر مت نکلنے دیجئے گا۔ یہ خونی اب بچ کر نہیں جا سکتا۔ دیوار کے پاس ایک ایک گز کی دوری پر جم جائیے۔"

بھیڑ دائیں طرف کی دیوار کے برابر برابر کھڑی ہونے کے لئے آگے بڑھی۔

"اور دیکھو رام اوتار دیوان جی" تھانے دار کنچن گڑھی نے دیسی شراب کی بوتل کا کاگ کھول کر بوتل اسے دیتے ہوئے کہا۔ "جب یہ دس گز بھاگ لے تو فائر کر دینا۔ سپاہی! تم تھیلے سے کرچ کے جوتے نکال لو۔ جہاں سے یہ بھاگے وہاں جوتے ڈال دینا۔ خالی کارتوس اور کتا بھی وہیں گرا دینا۔"

ڈھیلے ڈھیلے قدم رکھتا، سپاہیوں کے پنجوں کے مضبوط شکنجوں میں کسا ملزم وہاں تک چلا جہاں تک سپاہی اسے لے گئے۔ گیہوں کے کھیت کی مینڈھ آ گئی تھی۔

"رام اوتار۔ یہ بھاگ کر کوٹھی کے ادھر والے حصے کے کھیتوں کی طرف نہ جا سکے۔

دھیان رہے۔" تھانے دار بولا۔

"آپ چنتا نہ کریں سرکار، رام اوتار اناڑی نہیں ہے۔ اب یہ بچ کر کہاں جائے گا۔"

رام اوتار نے بوتل خالی کرتے ہوئے کہا اور بوتل کو پاس کھڑے سپاہی کے تھیلے میں اڑس دیا جس میں سے ابھی ابھی کرچ کے جوتے، خالی کارتوس اور دیسی پستول نکال کر زمین پر بکھرا دیئے گئے تھے۔ دیوان جی رام اوتار نے رائفل لوڈ کی

"اب آپ باؤنڈری کی دیوار کے پاس ہوشیاری سے کھڑے ہو جایئے" کپتان پولیس نے چلا کر کہا۔ اور دھیمے سے پاس کھڑے پہرے کے سپاہی سے بولے۔

"لکڑ بگھا کو ٹھی کے ادھر والے حصے کی طرف نہ بھاگ سکے۔ دھیان رکھنا۔ رائفل لوڈ کرلو۔"

اچانک ٹھنڈی ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور کپتان پولیس کی ریڑھ کی ہڈی کو ٹھنڈا کرتا ہوا گیہوں کے ان کھیتوں میں گھس گیا جہاں لکڑ بگھا چھپا ہوا تھا۔

تیز ہوا سے ہلتے پودھوں میں راستہ بناتا چٹ چٹ کرتا لکڑ بگھا نسبتاً کم گنجان کھیت کے حصے میں نکل آیا۔ گلاب کے کسی پودے کے کانٹوں میں الجھ کر منہ پر بندھا مسیکا پہلے ہی کہیں گر چکا تھا۔ رک کر، کانوں کو کھڑا کر کے ان کی نوکیں ملائیں اور ان نوکوں کے سرے چہار دیواری کی طرف کر دیئے جس کی دوسری طرف سے ابھی ابھی انسانی آوازیں سنائی دی تھیں۔ اچانک اسے اپنے پیچھے کچھ سرسراہٹ سی سنائی دی۔ بدن کو موڑے بغیر صرف گردن گھما کر دیکھا۔ دو پرچھائیاں تھوڑے ہی فاصلے پر کھڑی تھیں اور کھیت میں کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اور انسانی آواز میں کچھ بول رہی تھیں۔

ملزم نے سنا کر تھانے دار کنچن گڑھی نے ایک عجیب سی بے ہنگم آواز میں کہا تھا۔

"کمر پر لات مار کر اسے بھگاؤ رام اوتار۔"

"رام اوتار رائفل سنبھالے، گالی بکتا اس کی طرف بڑھا۔ ملزم کا چہرہ ان کی طرف نہیں تھا اس لیے کان جان بن گئے تھے۔ اس نے بہت واضح انداز میں سنا کر تھانے دار اور دیوان جی رام اوتار کے منہ سے جانوروں جیسی آوازیں نکل رہی تھیں۔

کمر پر لات پڑنے کی وجہ سے ملزم آگے کی طرف جھٹکے سے گرتے گرتے بچا اور پوری طاقت سے بھاگ پڑا۔ اس امید پر کہ شاید چہار دیواری پھلانگ سکے۔

لکڑ بگھے نے ان پر چھائیوں کی طرف مڑ کر دیکھا۔

کپتان پولیس نے ریوالور والے ہاتھ سے سپاہی کو اشارہ کیا سپاہی نے رائفل چھتیائی۔ لکڑ بگھا گردن گھما کر چٹ چٹ کرتا پوری طاقت سے گیہوں کے پودھوں میں الجھتا بھاگتا دیوار تک پہونچا۔

"فائر ---" کپتان پولیس پوری طاقت سے چیخے۔

جاڑوں کی نیم تاریک خاموش رات کئی فائروں کی آواز سے گونج گئی۔ درختوں پر بسیرا لیتے پرندے گھبرا کر اڑے اور دیر تک بولتے رہے اور دیر تک درختوں کے پتوں اور شاخوں سے الجھتے رہے۔ رام اوتار نے پھونک مار کر رائفل کا دھواں صاف کیا اور کھیتوں میں پھڑکتے ملزم کو ایک نظر دیکھا۔

پہرے کے سپاہی نے دوبارہ بولٹ کیا اور بھاگتے ہوئے لکڑ بگھے پر فائر کیا۔ اس بار بھی نشانہ چوکا۔ لکڑ بگھا دیوار کے پاس پہونچ کر ایک پل کو ٹھٹکا اور پوری قوت سے چہار دیواری کو پھلانگنے کے لئے چھلانگ لگادی۔

کپتان پولیس تیزی سے مڑے اور پھاٹک سے نکل کر دیوار کے پیچھے جا کر دیکھا۔ لاٹھیاں لئے ہوئے لوگ اس پر جٹے ہوئے تھے اور وہ پیٹھ کے بل پڑا تڑپ رہا تھا۔ انہوں نے ایک نظر لکڑ بگھے کو دیکھا۔ چہرے کا پسینہ پونچھتے تیزی سے پیچھے مڑے اور بھاگ کر اندر آکر پہرے کے سپاہی کو حکم دیا۔

"جا کر دیکھو لکڑ بگھا مرا کہ نہیں۔ گیٹ کے اندر کسی کو مت آنے دینا خبردار!"

ریوالور جیب میں ٹھونستے ہوئے بھاگتے قدموں سے وہ اپنے آفس میں داخل ہوئے، کرسی پر خود کو گرا کر آنکھیں بند کر کے انہوں نے خیال کیا کہ جب لکڑ بگھے پر فائر ہوا تھا تو کوٹھی کے اس طرف بھی فائر کی آواز سنائی دی تھی۔ انہیں حلق میں سانس گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ آنکھیں کھولیں۔ سامنے تھانے دار کنچن گڑھی، دیوان جی رام اوتار اور

دونوں سپاہی اٹنشن کھڑے تھے۔

"رام اوتار۔" انہوں نے بہت تھکی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کیا مرتے دم وہ رو رہا تھا۔؟"

"ہاں سرکار۔" آفس میں داخل ہوتے ہوئے پہرے کے سپاہی نے کہا جس کے چہرے پر خوف و ہراس کے آثار تھے اور سانسیں زور زور سے چل رہی تھیں۔

"ہاں سرکار۔" وہ رو رہا تھا۔ مرتے مرتے رو رہا تھا۔ گاؤں والے کہہ رہے تھے کہ جنگلی جانوروں کو انہوں نے کبھی روتے نہیں دیکھا ہیں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا سرکار وہ مر رہا تھا اس کا سینہ زور زور سے ہل رہا تھا اور آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بے آواز بہہ رہی تھی۔"

کپتان پولیس کرسی سے اٹھے، میز پر چڑھے اور چاروں ہاتھوں پیروں سے میز پر کھڑے ہو کر چھت کی طرف گردن اٹھا کر زور زور سے رونے لگے۔

فہرست

۱۔ آدمی ۹
۲۔ چکر ۱۹
۳ لکڑ بگھا ہنسا ۲۹
۴۔ بڑے پل کی گھنٹیاں ۴۵
۵۔ کعبے کا ہرن ۵۵
۶۔ لکڑ بگھا رویا ۶۵
۷۔ دوسرا کنارہ ۷۷
۸۔ گدھ ۸۷
۹۔ لکڑ بگھا چپ ہو گیا ۹۵
۱۰۔ وہ ایک لمحہ ۱۰۷
۱۱۔ ڈار سے بچھڑے ۱۱۵

دوسرا کنارہ

دوسرا کنارہ

بحر عرب کے شمال میں غروب ہوتے سورج کی زرد روشنی میں رنگی سمندر کی سنہری موجیں کراچی شہر کے کلفٹن ساحل سے ٹکرائیں، سفید جھاگ فاکستری پتھروں پر پھیلے ، بکھرے اور پانی ہو گئے۔

اس وقت غروب کا وقت نہ ہوتا اور کرنوں کا رنگ بھی زرد نہ ہوتا تو بھی ادھر سے آنے والی موجوں کا رنگ سنہرا ہی ہوتا۔ سونے جیسا سنہرا رنگ۔ کیوں کہ بحر عرب میں کلفٹن کی طرف جو پانی آتا ہے وہ اب سنہرا ہی ہوتا ہے۔

ایسا میں نے سوچا۔

اور اس سوچ میں چھپے حسد کو محسوس کر کے میں شائد شرمندہ ہوا۔ اور کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے آتی جاتی لہروں پہ سے نگاہیں واپس کھینچیں اور گھنے سیاہ بالوں کے نیچے سے اس کی نیلی نیلی آنکھوں نے مجھے غور سے دیکھا۔ کہیں یہ میری سوچ نہ پڑھ لے، اس خوف نے مجھے جھوٹ موٹ بے خوف کر دیا۔ تب میں نے بھی اسے غور سے دیکھا۔ وہ سبز رنگ کا ڈھیلا ڈھالا لبادہ پہنے تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا تم کوہ قاف والی سبز پری ہو۔؟"

اس نے میری طرف حیرت بھری آنکھوں سے دیکھا اور کھل کھلا کر ہنسی اور کہا۔

"نہیں... میں کراچی شہر میں کشمیر روڈ پر رہتی ہوں۔ میرا نام عظمیٰ ہے اور میں آٹھویں کلاس میں پڑھتی ہوں۔"

یہ سب کہہ کر وہ اس طرح مسکرائی۔ جس طرح ان چھوٹی چھوٹی ہنسی خوشی کی باتوں پر مسکرایا جاتا ہے اور تب میں نے سوچا کہ یہ سبز پری اتنی بچی بھی نہیں کہ ان چھوٹے

چھوٹے مذاقوں کو نہ سمجھ سکے اور اتنی بڑی بھی نہیں کہ میں اس سے ایسے مذاق نہ کر سکوں۔

تب میں نے بہت اعتماد کے ساتھ اس سے پوچھا:

"اے لڑکی! اگر تم سبز پری نہیں ہو تو اس قدر اچھی کیوں لگتی ہو؟"

تب اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مسکرا کر بولی۔

"ہمارے یہاں سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ہم آپ کو سب سے ملوائیں گے۔ آپ نے ہمارے پاپا کو نہیں دیکھا اُن کے ماتھے پر تو لگتا ہے جیسے روشنی سی پھوٹ رہی ہو۔"

میں نے پوچھا۔

"ہمارے یہاں تو دیوتاؤں کے ماتھے سے روشنی پھوٹتی ہے۔ کیا تمہارے پاپا دیوتا ہیں؟"

"نہیں بھائی ہمارے یہاں دیوتا لوگ نہیں ہوتے۔ یہ تو آپ کی طرف ہوتے ہیں۔"

وہ جھنجھلائی بھی اور مسکرائی بھی۔ پھر کہا۔

"پاپا پرسوں ملتان سے واپس ہوں گے تب دیکھ لیجئے گا۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوئی اور میں نے سمندر میں واپس جاتی ایک موج کو دیکھ کر سوچا۔

جب میں ہندوستان سے چلا تھا تو اپنے عزیزوں کے بارے میں خصوصاً نوجوانوں اور بچوں کے بارے میں کوئی واضح تصور ذہن میں نہیں تھا۔ بس یہ اندازہ تھا کہ جب میں اپنے عزیزوں کے بیچ پہنچوں گا تو سارے بچے مجھے گھیر کر بیٹھ جائیں گے، سارے نوجوان میرے قریب آکر کھڑے ہو جائیں گے اور سارے بزرگ مجھے گلے لگا کر پوچھیں گے کہ جنھیں ہم اب سے بہت برس پہلے چھوڑ آئے تھے وہ اب کیسے ہیں اور ہیں بھی یا ماضی کے کھنڈر میں کہیں دب گئے۔ اور وہ جو اس محلے میں.... اور نوجوان مجھ سے دریافت کریں گے کہ وہاں آپ کے ہاں لوگ اتنا لڑائی جھگڑا کیوں کرتے ہیں اور کیا آپ لوگوں کو یونیورسٹیوں میں آسانی کے ساتھ داخلے مل جاتے ہیں اور کیا آپ لوگوں کو نوکری حاصل کرنے میں بہت پریشانی اٹھانی پڑتی ہے.... اور کیا آپ....

اور بچے سوال کریں گے کہ یہ جو ہم لوگ تصویروں میں تاج محل اور قطب مینار

دیکھتے ہیں تو کیا آپ نے ان کو سچ مچ دیکھا ہے۔ بمبئی آپ کے یہاں سے کتنی دور ہے اور کیا آپ نے ایتابھ بچن کی کوئی شوٹنگ دیکھی ہے اور کیا آپ....

سبز پری کی آواز نے مجھے واپس ساحل پر بلالیا۔ اس نے ہولے سے رازداری لہجے میں بہت اپنائیت کے ساتھ مجھ سے پوچھا

"اب آپ ہمیشہ کے لیے آگئے ہیں۔ واپس تو نہیں جانا ہے نا؟"

اس سوال پر مجھے تعجب ہوا۔

"بی بی میں پندرہ دن بعد واپس چلا جاؤں گا۔ مجھے ملازمت پر جانا ہے۔ گھر پہنچتے ہی۔"

"ارے!!!" اس کے منہ سے بس اتنا ہی نکلا۔

میں نے اس کے چہرے پر دوڑتے حیرت کے رنگ کو بہت واضح انداز میں محسوس کیا۔ وہ پلکیں جھپک جھپک کر مجھے دیکھ رہی تھی۔

لیکن ارشد بھائی نے تو یہاں آتے ہی پاسپورٹ پھاڑ دیا تھا اور اب وہ دوبئی میں ہیں اور قیصر بھائی... اور...

"نہیں۔ میں واپس جاؤں گا۔"

اس کے چھوٹے سے ذہن نے میرے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کی لیکن کیوں کہ میں چالاک تھا اس لیے وہ ناکام رہی۔ پھر وہ اچانک بولی جیسے اسے کوئی کھویا ہوا ہتھیار مل گیا ہو۔

"ہم نے اس دن ریڈیو پر سنا تھا کہ وہاں بہت سے.... ہزاروں کی تعداد میں بے گناہ..... اور منگل کے روز ٹی وی پر بتایا تھا کہ.... کیا نام ہے اس شہر کا۔ اسے چھوڑیے خود پاپا اخبار میں پڑھ کر بتا رہے تھے کہ... اور سب کو چھوڑیے ہم نے خود جب گانے سننے کے لیے آل انڈیا ریڈیو لگایا تو خبریں آرہی تھیں کہ کہیں یہ پھر.....

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

اس نے میرا ہاتھ ہٹا کر کہا۔

"کیا آپ کے علاوہ سبھی لوگ جھوٹ بولتے ہیں؟"

تب میں نے سوچا کہ کچھ غیر اہم لمحے بھی کس قدر خونخوار ہوتے ہیں اور تبھی میں نے یہ بھی سوچا کہ میں ٹیلی وژن، ریڈیو، اخبار اور درسی کتابوں کے مقابلے میں کس درجہ کمزور انسان ہوں۔

تو کیوں کہ میں جواب نہیں دے سکتا تھا اس لیے خاموش رہا اور کیوں کہ میں خاموش تھا اس لیے سیاہ ہوتے سمندر میں دوڑتی سفید موجوں کو دیکھتا رہا۔

مجھے خاموش دیکھ کر وہ بھی چپ ہو گئی تھی۔ پھر وہ اس طرح بولی جیسے میرا دھیان بٹا رہی ہو:

"بھائی! ہندوستان واپس جا کر آپ سب کو بتائیے گا کہ یہاں آپ نے کتنی طرح کی کاریں دیکھیں۔ ہم لوگ کلفٹن جس کار سے آئے ہیں یہ مرزڈا ہے اور دوسری ہوتی ہے ٹوئے ٹا۔ لمبی والی ہوتی ہے امپالا۔ اور سب سے مہنگی ہوتی ہے مرسی ڈیز۔ مرسی ڈیز کئی سائز میں ہوتی ہے۔ اس میں چھ دروازے تک ہوتے ہیں۔ ہم آپ کو ساری کاریں دکھائیں گے۔ ہمارے یہاں سارے رشتے داروں کے پاس ہیں۔ پاپا کے سب دوستوں کے پاس دو دو موٹریں ہیں خوب بڑی بڑی۔ آپ کے ہاں تو ایسی کاریں بھی نہیں ہوتی ہوں گی، ہیں نا؟"

مجھے پھر تعجب ہوا۔ میں خاموش رہا۔ بس اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے میرے بہت پاس آ کر کہا۔

"بھائی!"

میں چپ چاپ اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔

"او بھائی۔ آپ چپ کیوں ہو گئے۔ کیا آپ کو اپنے امی بابا یاد آ رہے ہیں، بتائیے نا کیا آپ کو اپنے امی بابا یاد آ رہے ہیں؟"

میں نے اس کے بھولے بھالے چہرے کو دیکھا۔ سمندر کو دیکھا، تاریک ہوتے آسمان کو دیکھا اور پھر مڑ کر ریگستان سندھ کو عبور کیا اور پنجاب کی ہری بھری کھیتیوں کو پار کر کے گنگا جمنا کے دو آبے میں پہونچا اور آم کے گھنے باغات میں سوئے ہوئے اپنے

خاموش قصبے کو دیکھا جہاں پندرہ دن بعد میں واپس پہونچ جاؤں گا۔ اسٹیشن سے اتر کر کچے راستے پر آؤں گا تو کائی زدہ گنبد دور سے نظر آجائیں گے۔ درگاہ شریف کے بعد بڑا سا پھاٹک آئے گا۔ پھاٹک میں داخل ہوتے ہی ایک چوک نظر آئے گا اس چوک میں اونچی کرسی کا ایک بڑا سا حویلی نما مکان ہوگا جس کے صدر دروازے سے گزر کر جب میں ڈیوڑھی پار کروں گا تو وسیع صحن کے بعد اونچی شکستہ محرابوں کے دالان میں وہ کھڑا نظر آئے گا جس کے ماتھے سے مجھے روشنی پھوٹتی محسوس ہوتی ہے۔ میری بستی میں آج کل مان سون کی گھمسان ہوگی۔ میرا بابا دالان کے در میں کھڑا الحمد شریف پڑھ پڑھ کر آسمان پہ پھونک رہا ہوگا۔ مان سون کو اپنی بستی میں بسیرے کی دعوت دے رہا ہوگا۔ تاکہ کھیتوں میں کھیتوں کا سونا اگے اور کھلیانوں میں کھلیانوں کے موتی برسیں۔

سبز پری نے میرے بابا کا نام لیا تو مجھے وہ یاد آگئے۔ کسی اور چیز کا نام لیتی تو مجھے وہ چیز یاد آجاتی کیوں کہ اس وقت میرے ذہن کی لگام اس کے ہاتھوں میں تھی۔

میں نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دی کہ ریڈیو سنکر، اخبار اور ٹیلی ویژن دیکھ کر اور درسی کتابیں پڑھ پڑھ کر اب بچے بھی یہ تفریق کرنے لگے ہیں کہ آپ کے یہاں ایسا ہوتا ہے اور ہمارے یہاں ویسا ہوتا ہے۔ لیکن... ابھی ایک چیز بچی ہے۔ ہماری خوشیاں اور غم تو ایک ہی جیسے ہیں، ہمارے تہوار اور تقریبات تو یکساں ہیں۔ خوش ہونے کے ڈھنگ تو وہی ہیں یا کم از کم یہ احساس تو ہے ہی کہ ہمارے ریت رواج سب مشترک ہیں۔

سبز پری نے میرے ذہن کی لگام موڑ دی۔

"شام کو یہاں سب تفریح کرنے نکل آتے ہیں کاریں اٹھائیں اور زن سے کلفٹن پہ آگئے۔ شام کے بعد سمندر تو ٹھیک سے نظر آتا نہیں اس لیے سمندر کی باؤنڈری پہ آکے کار تو روک دیتے ہیں لیکن ہیڈلائٹس جلائے رکھتے ہیں جن کی روشنی میں سمندر کا پانی دور تک جھل مل جھل مل کرتا ہے۔

مجھے پھر حیرت ہوئی اور میں نے پھر مڑ کر اپنے بابا کو دیکھا۔ عشاء کی نماز کے بعد وہ بڑا بلب بند کر دیتے ہیں اور چھوٹا بلب جلا دیتے ہیں۔ پھر اپنے پلنگ پر لیٹے دیر تک

ریڈیو سے خبریں سنتے رہتے ہیں اور دیر تک جانے کیا کیا سوچتے رہتے ہیں۔ پھر آیتہ الکرسی پڑھ کر دستک دیتے ہیں اور اس امان دینے والے سے امان مانگتے ہیں جس نے دوستوں کو رفاقتیں اور دشمنوں کو عداوتیں دی ہیں اور پھر اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے بے خواب نیند سونے کے لیے لیٹ جاتے ہیں کہ صبح اٹھ کر پھر دن بھر دھوپ سے لڑنا ہوگا۔

پیچھے سے کسی کار کا ہارن بولا اور کوئی منڑا یا ٹوئے ٹا یا امپالا یا مرسی ڈیز آکر رک گئی لیکن ہیڈ لائٹس روشن رہیں۔ ہم دونوں کے طویل سائے پر شور سمندر کے تاریک سمندر میں دور تک پھیل گئے اور بہتے ہوئے پانی میں کانپنے لگے۔

پیچھے پھر کوئی کار آکر رکی اور اس کی ہیڈ لائٹس کی دو موٹی موٹی متوازی لکیریں سمندر میں داخل ہو گئیں اور پانی پر دور روشن راستے نظر آنے لگے۔

سبز پری خوشی سے جھوم اٹھی۔

"دیکھئے بھائی دیکھئے۔ ابھی جو کار آکر رکی اس کی روشنی میں پانی دیکھئے کیسا جھل مل جھل مل کر رہا ہے۔

"سبز پری" میں نے اسے ہولے سے پکارا لیکن مجھے اپنی آواز اجنبی لگی اس لیے میں چپ ہو گیا اور اس سے نہیں کہہ سکا کہ سبز پری دوسرے کی کار کی روشنی میں سنہرے پانی کی جھل مل جھل مل تو دیکھ رہی ہو لیکن ذرا سا ہٹ کر دیکھو اس تاریک پر شور سمندر میں تمہارے اور میرے سایے کیسے کانپ رہے ہیں کیسے لرز رہے ہیں۔

جانے کیوں مجھے سبز پری کی خوشی پر حیرت ہو رہی تھی۔ شاید یہ حیرت ہی میرے زخم کا علاج تھی۔

: آپ تو بالکل خاموش ہو گئے بھائی۔ پرسوں... آپ سن رہے ہیں نا۔ پرسوں سیما کی روزہ کشائی ہے۔ آپ ضرور آئیے گا آپ کو تو ضرور ہی ضرور آنا ہے۔ ورنہ....."

یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئی۔ ہم فصیل پر کھڑے تھے اور یتر سمندری ہواؤں سے ہمارے لباس بے قابو ہو رہے تھے۔

اپنے سبز لباس کو سنبھالتی ہوئی وہ بہت اچھی لگی اور میں نے یہ کہہ کر دل کو ڈھارس

دی کہ میں نے ٹھیک ہی سوچا تھا ابھی ہم میں اور تم میں بہت کچھ مشترک ہے۔ ہمارے ریت رواج ہمارے طریقے، ہماری رسمیں، ہماری عیدیں، ہمارے روزے... اچھی لڑکی میں روزہ کشائی میں ضرور آؤں گا۔ ہاں ابھی ایک ساحل باقی ہے جس پر ہم تم دونوں کھڑے ہو سکتے ہیں۔

وہ بالوں کو سنبھالتی ہوئی میرے نزدیک آئی اور سمجھانے والے انداز میں بڑی محبت کے ساتھ مجھ سے بولی۔

"جمعہ کے دن روزہ کشائی میں آپ آئیے گا ضرور ورنہ جب آپ اپنے گھر واپس جائیں گے تو کسی کو یہ بھی نہیں بتا پائیں گے کہ....."

تیز ہوا کا ایک بھیگا ہوا جھونکا ہمارے پاس سے گذرا۔ اس کے بال اڑنے لگے۔ وہ بال سنبھالنے لگی اور جملہ پورا نہیں کر سکی۔

میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں ہاں بولو۔ میں کیا نہیں بتا پاؤں گا سبز پری؟"

تب اس نے بے حد اعتماد اور یقین کے ساتھ کہا۔

"آپ کسی کو یہ بھی نہیں بتا پائیں گے کہ روزہ کشائی کیا ہوتی ہے۔"

تاریک سمندر میں دور سے ایک پر شور بھیانک موج راستہ بناتی ہوئی آئی اور میرے قدموں کے پاس آکر اس قدر زور سے ٹکرائی کہ میرا پورا وجود ہل کر رہ گیا۔ اور مجھے میرا ساحل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا جس پر ہم اور وہ دونوں کھڑے تھے۔

وہ کہہ رہی تھی۔

"ایسا ہوتا ہے بھائی کہ جب کوئی بچہ پہلا روزہ رکھتا ہے تو سب کو خبر کر دی جاتی ہے اور اس دن بہت سے مہمان....."

میں نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا اور اس کی نیلی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ وہ سب کچھ سچ سمجھ کر کہہ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کہیں بھی جھوٹ نہیں تھا۔ یقین ہی یقین تھا۔

اور اب میں صرف ایک ہی کام کر سکتا تھا جو میں نے کیا۔ میں نے اس کے اڑتے ہوئے بالوں کو برابر کیا اس کے روشن چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی کو ہولے سے چوما اور چپ چاپ اداس ہو گیا۔

اس بار مجھے حیرت نہیں ہوئی تھی۔ حیرت سے اتنے بڑے زخم کا علاج ممکن بھی نہیں تھا۔

○○

گِدھ

۱۲- جنرل نالج سے باہر کا سوال ——— ۱۴۹
۱۳- منظر ——— ۱۵۷
۱۴- ببول کے کانٹے ——— ۱۸۳
۱۵- بلبلہ ——— ۱۹۵
۱۶- قدیم معبدوں کا محافظ ——— ۲۰۳
۱۷- قربانی کا جانور ——— ۲۰۹
۱۸- آخری بن باس ——— ۲۲۳
۱۹- روگ ——— ۲۲۵

گِدھ

ریشمی رونگٹے غصے سے کھڑے ہو گئے۔ چھوٹی چھوٹی دمیں تیزی سے گردش کرنے لگیں۔ بانچھوں سے نکیلے دانت باہر نکل پڑے اور وہ دونوں خرگوش ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے۔

اور ادھر وہ ایک دیوقامت شیشم کے درخت پر بیٹھ چکا تھا۔ وہ ایک ایسی شاخ منتخب کر کے بیٹھا تھا کہ اسے نیچے کی ہر چیز بالکل واضح نظر آسکے۔ وہ ہمیشہ یہی کرتا ہے۔

تھوڑی دیر پہلے تک وہ اپنے منحوس شہپروں کی مدد سے فضا میں اڑ رہا تھا۔ اور چھوٹی مکار آنکھوں سے نیچے کا سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ اوپر سے اس نے دیکھا تھا کہ نیچے جنگل میں دو مدھم نقطے آپس میں گتھے ہوئے ہیں اور کچھ ہی دیر میں فنا ہونے والے ہیں۔ بس..... اس کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ فضا میں ہی کلکاری مار کر اس نے کئی بار اپنی منحوس اور مکروہ آواز نکالی اور پھر تیزی سے زمین کی طرف پرواز کرنے لگا اور جہاں وہ دونوں لڑ رہے تھے وہیں ایک شیشم کے درخت پر آکر بیٹھ گیا۔

برسہا برس سے گدھ کا یہی معمول ہے۔ جبلت اور ایک عمر کے تجربے نے اسے بتا دیا ہے کہ قدرت کی طرف سے اسے روزانہ غذا ملے گی اسے کرنا یہ ہوگا کہ پرواز اونچی، نگاہیں تیز اور اشتہا کھلی رکھے اور ..... یہ تمام چیزیں تو اسے ودیعت تھیں۔ دنیا جب بنی تو وہ یہ چیزیں اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ وہ ہمیشہ بہت اونچائی پر اڑتا ہے۔ اس کی نظریں اتنی تیز ہیں کہ پہاڑ کے دونوں طرف کے جنگل اس کی بصارت کی گرفت میں رہتے ہیں۔ وہ بڑے پانیوں کے ادھر کے جنگل بھی صاف صاف دیکھ سکتا ہے۔ جنھیں جنگل کے تمام جانور دو حصوں میں بٹا ہوا سمجھتے ہیں۔ لیکن گدھ کے لئے تو سارے جنگل ایک ہی ہیں، چاہے وہ پہاڑ کے جنگل ہوں، بڑے پانیوں کے ادھر کے جنگل ہوں یا وہ جنگل جو پانی میں ٹاپوؤں پر اگ آئے ہیں۔ اس کی نگاہیں اتنی تیز ہیں کہ جنگل کا کوئی جاندار ان سے محفوظ نہیں اور بھوک تو ایسی کھلی ہوئی ہے

کر حلق سے اترتے ہی گوشت ہضم ہو جاتا ہے۔

وہ ہمیشہ یا تو بہت اونچا اڑتا نظر آتا ہے یا پھر اچانک درخت پر دکھائی دیتا ہے جب اونچائی پر ہوتا ہے تو جنگل والے خود کو محفوظ سمجھتے ہیں اور جب..... درخت پر نظر آتا ہی تو اتنا وقت کب رہتا ہے کہ اپنے جسموں کا بچاؤ کر سکیں۔ جب گدھ اوپر سے نیچے کی طرف جھپٹتا ہے تو اس گھڑی جانور آپس میں لڑ رہے ہوتے ہیں۔ بچاؤ کرنے کے متعلق سوچیں..... اتنی فرصت کہاں ہوتی ہے۔

تو یہی ہوا..... وہ کریہہ آواز یں نکالتا زمین کی طرف آیا اور شیشم کے درخت پر بیٹھ گیا۔ پروں کو ایک دفعہ زور زور سے پھڑپھڑایا اور سمٹ گیا۔ خرگوشوں کو خبر بھی نہ ہو سکی کہ وہ آچکا ہے..... وہ... جو بدن کے ریشمی رونگٹوں کو بھی نہ چھوڑے گا۔ گدھ کی آنکھوں کی چمک اب سے تھوڑی دیر بعد حاصل ہونے والے گوشت اور خون کے تصور سے سرخی بن کر اس کے دیدوں میں تیرنے لگی۔

ایک سفید خرگوش تھا دوسرا بھورا۔ وہ جنگل میں ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتے تھے اور اپنی ماداؤں سے محبت کرتے تھے۔ آج صبح کا چارا کھا کر جب وہ مست ہوئے تو سورج کچھ اس انداز سے نکلا کہ دونوں کا دل چاہا کہ ایک دوسرے کی مادہ کو چھیڑ کر دیکھیں۔ اب یہ تو جنگل والے جانیں کہ پہل کس نے کی پہل کسی نے کی ہو، ماداؤں کو دونوں نے چھیڑا۔ ماداؤں کو چھیڑنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آج کچھ کام بھی نہیں تھا۔ کل ہی دونوں نے اپنے اپنے بلوں کی مرمت ختم کی تھی تو آج بجائے اس کے کہ نئے بل بناتے یا چارے کی نئی جگہ تلاش کرتے کہ اگلے موسموں میں راحت ملے، وہ دونوں ایک دوسرے کی ماداؤں کو چھیڑ بیٹھے۔

تھوڑی دیر تک تو یہ چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی لیکن جیسے ہی خیال آیا کہ دوسرا میری مادہ کو اذیت دے رہا ہے، تو دونوں کو پچھلے موسموں کے دھندلے دھندلے اسی قسم کے واقعات یاد آگئے۔ اور دونوں نے بیک وقت یہ سوچا کہ یہ اگلا تو بہت دن سے اسی تلاش میں تھا کہ میری مادہ کو تکلیف دے اور مجھے بے عزت کرے، تو بس یہ خیال آنا تھا کہ دونوں کے ریشمی رونگٹے غصے سے کھڑے ہو گئے۔ چھوٹی چھوٹی دمیں تیزی سے ہلنے لگیں اور بانچھوں سے نکیلے

دانت باہر نکل پڑے اور وہ دونوں ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے۔ ایک دوسرے کو نوچنے کھسوٹنے رہے۔ لہو بہتا رہا اور سبز گھاس پر سرخ لکیریں کھنچتی رہیں، اوپر بیٹھے اس گدھ سے دونوں انجان رہے جو اطمینان سے بیٹھا خوش ہو رہا تھا کہ اس کی بھوک مٹنے کا وقت قریب سے قریب تر آتا جا رہا تھا۔ گردن نیوڑھائے، سر نیچا کیے، آنکھوں میں سرخی بھرے وہ یہ منظر دیکھتا رہا۔

ہوائیں تیز ہو گئیں۔ درختوں کی شاخیں آپس میں ٹکرائیں، خشک پتے زور سے کھڑکھڑائے اور دھوپ کا رنگ چمک اٹھا۔ . . . ایک بزرگ پرندے نے شاخوں پر بے چینی سے پہلو بدلا اور پتیوں سے سر نکال کر دیکھا۔ دونوں خرگوشوں کو دیکھا اور گدھ کو دیکھا۔ دکھی ہو کر آنکھیں بند کیں اور سوچا کہ کتنے مزے کی بات ہے کہ کسی ایک نے یہ خیال نہیں کیا کہ میں نے بھی تو دوسرے کی مادہ کو چھیڑا ہے۔ کاش اگر یہ سوچ لیا ہوتا تو شاید اس دکھ کی تلافی ہو جاتی جو دوسرے کے ہاتھوں اپنی مادہ کو اذیت پہنچتے دیکھ کر ہوا تھا اگر یہی سوچ لیا ہوتا تو یہ سرخ بوندوں کا کھیل کیوں شروع ہوتا۔ ہری ہری گھاس ایسے پامال کیوں ہوتی۔ جنگلوں میں ایسا کسی نے سوچا ہے، جو آج سوچتے۔ تمام جنگلوں میں بلا سوچے سمجھے سبزے پامال کیے جا رہے ہیں۔ ہر طرف اپنے پنجوں اور دانتوں سے ایک دوسرے کو نوچنے کھسوٹنے کا کھیل ہو رہا ہے۔ اور یہ منحوس گدھ جو ہمیشہ اسی تاک میں رہتا ہے چپ چاپ اوپر سے دیکھتا ہے اور مکروہ آوازیں نکالتا ہوا جھپٹ کر نیچے آجاتا ہے۔ کوئی دیکھ بھی نہیں پاتا کہ کب اوپر سے آکر نیچے شیشم کے درخت پر بیٹھ گیا اور پھر..... یہ بے روح، نرم و نازک جسموں میں اپنی تیز اور نکیلی چونچ مارتا ہے اور کھال کے بھیتر کا سرخ گوشت نوچ کر کھا جاتا ہے۔ بدن کی ہر چیز کھاتا ہے صرف سفید سڈول ہڈیاں رہ جاتی ہیں بے جان ڈھانچے جنگل والوں کے لئے سبق ہوتے ہیں۔ جن کی ہڈیاں تیز ہواؤں میں ہلتی ہیں اور کہتی ہیں، دیکھو... خوب غور سے دیکھو، ہم سے چوک صرف اتنی ہوئی تھی کہ ہمیں دھیان نہیں رہا تھا کہ کسی کے پروں کے پھڑپھڑانے کی آواز آرہی ہے۔

اور پھر موسمی ہوائیں ان ہڈیوں کو اِدھر سے اُدھر کر دیتی ہیں اور جنگل والے سب کچھ

بھول جاتے ہیں۔

بزرگ پرندے نے سوچا کہ افسوس صرف ان دو خرگوشوں کا نہیں جو تھوڑی دیر بعد گدھ کی خوراک بننے والے ہیں بلکہ دکھ اس ناسمجھی کا ہے کہ جانوروں کو اب تک معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ ان تمام جنگلوں میں اول دن سے کچھ ایسے کیڑے رینگ رہے ہیں جو پانی اور چارے کے ساتھ اندر پہنچ کر ذہن کے اس حصے کو چاٹ چاٹ کر کھوکھلا کر دیتے ہیں جو بھلا اور برا سوچتا ہے۔ ان کیڑوں کا گدھ سے بڑا قریبی تعلق ہے۔ یہی کیڑے تو آخر کار گدھ کو گوشت فراہم کرتے ہیں۔

یہ کیڑے ختم ہونے چاہئیں۔ کیا میں انھیں ہلاک کر سکوں گا؟ میں تو زیادہ سے زیادہ اس درخت کی جڑ میں جتنے کیڑے ہیں انھیں ختم کرنے کی طاقت رکھتا ہوں لیکن یہ کیڑے تو ہر جگہ ہیں۔ سارے جنگلوں میں ہیں اور جنگلوں میں ہی نہیں، ریگزاروں میں بھی تو ہیں جہاں زمین کے نیچے پانی نہیں تیل بہتا ہے۔ یہی کیڑے تو ہیں جنھوں نے بڑے پانی کے اوپر والے سیاہ جنگل میں سفید اور کالے دونوں جانوروں کے بھیجوں کو چاٹ لیا ہے۔ یہ کیڑے سفید اور کالے دونوں جانوروں میں تفریق نہیں کرتے۔ ان کا کام تو بس گدھ کے واسطے گوشت مہیا کرنا ہے۔ سو یہ اول دن سے کرتے آرہے ہیں۔ رینگتے رینگتے بھیجے میں پہنچے اور اسے کھوکھلا کرنا شروع کر دیا اور جیسے ہی دماغ کھوکھلا ہوا جانور یہ بھول جاتے ہیں کہ اب ہم اپنے ان ساتھوں کو سینگوں، دانتوں اور پنجوں سے بھنبھوڑے جا رہے ہیں جن کے ساتھ ہم نے سبزے پر لوٹیں لگائی تھیں اور تالابوں کا پانی پیا تھا اور ساتھ بیٹھ کر جگالی کی تھی اور پھر.....

یہ جانور ایک دوسرے سے لپٹ پڑتے ہیں۔ بے روح اور بے جان ہو کر گر پڑتے ہیں.....

اور پھر..... گدھ درخت سے نیچے اتر آتا ہے.. میری آواز کوئی نہیں سنتا کہ راستے میں شاخیں اور پتے اتنے زیادہ ہیں کہ آواز الجھ کر رہ جاتی ہے اور اتنی طاقت میرے بدن میں نہیں کہ تمام جانوروں کو جمع کر کے آگاہ کروں۔ مجھ جیسے پرندوں کو اتنی طاقت بخشی ہی نہیں گئی۔

اور آخر میں جب سفید اور بھورے دونوں خرگوشوں نے اپنے بدن کا سارا خون بہا کر

ریشمی رونگٹوں کو سرخی میں لتھیڑ دیا اور زخموں سے عاجز آ کر گر پڑے تو گدھ پھڑپھڑاتا ہوا نیچے اترا۔ اور ان کی لاشوں پر جھپٹ پڑا جو اگر زندہ ہوتے اور ان کے بھیجے کیڑوں نے نہ چاٹ لیے ہوتے تو اس وقت کسی درخت کی جڑ میں بھر بھری مٹی اڑا اڑا کر کلیلیں کر رہے ہوتے۔

اب گدھ اِن ... ان معصوموں کے گوشت کا ایک ایک ریشہ کھا چکا ہے اور اب وہ اپنے شہپروں کی مدد سے پھڑپھڑاتا ہوا فضا میں اڑان بھی بھر چکا ہے۔ جبلت اور ایک عمر کے تجربے نے اسے یہ بات بتا دی ہے کہ اسے روز غذا ملے گی۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ کس جنگل کے جانوروں کے بھیجوں کو کیڑوں نے چاٹ رکھا ہے۔ گدھ کی اڑان بہت اونچی..... نگاہیں..... بہت تیز ہیں اور بھوک..... بہت بے تاب اور بہت بے رحم ہے جو ہمیں اتنا موقع بھی نہیں دیتی کہ دیکھ سکیں کہ نیچے پیروں کے پاس کیڑے سے کیا رینگ رہے ہیں اور۔

.....

اور..... اوپر یہ پروں کی پھڑپھڑاہٹ سی کیسی سنائی دے رہی ہے.....

لکڑ بگھا چُپ ہو گیا

لکڑ بگھا چپ ہو گیا

اسٹیشن سے گاڑی نکلے ابھی ذرا ہی دیر ہوئی تھی کہ سینکڑوں فولادی قینچیوں پہ چلتی ریل گاڑی نے سیٹی بجائی۔ انجن سے گارڈ کے ڈبے تک تمام ڈبوں کے بریک چرچرائے اور شروع ہوتی برساتی رات تلے روشن اور نیم روشن کوپے چپ چاپ کھڑے ہو گئے۔ ریل کے شور میں دبی مسافروں کی آوازیں بلند اور واضح ہو گئی تھیں۔

کھڑکیوں کے شیشوں کے باہر تیز بارش شروع ہو چکی تھی۔ ماہوٹ کی بارش کا پانی ڈبے کی چھت سے بہہ کر شیشوں تک آتا، بوند بوند کر کے آہستہ آہستہ نیچے سرکتا اور جب کئی بوندیں کسی جگہ مل جاتیں تو ایک بڑی بوند بن کر نم لکیر بناتا کھڑکی کے نچلے حصے کی طرف بہتا چلا جاتا۔ اسے یہ کھیل دیکھنے میں مزہ آ رہا تھا۔

"کیوں رک گئی" نانا نے برابر والے سے پوچھا۔ وہ نانا کے پہلو سے لگا بیٹھا تھا، کسمسایا اور پھر بوندوں کا کھیل دیکھنے لگا

"کیا معلوم .... کالج کے لونڈوں نے زنجیر کھینچ دی ہوگی۔" سامنے بیٹھا مونچھوں والا مسافر بولا۔

"آج تو اتوار تھا۔ کوئی اور بات ہے۔ ذرا دیکھنا بھائی۔ کیا چکر ہے۔؟"

"باہر بہت بارش ہے بڑے میاں۔" کھچا کھچ بھرے ڈبے میں وہ جگہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

نانا نے کھڑکی اوپر سرکائی ہی تھی کہ ٹھنڈی ہوا اور تیز بوچھار اندر گھس آئی۔ کئی مسافروں نے احتجاج کیا لیکن نانا نے کھڑکی کے باہر سر نکال کر دیکھ ہی لیا۔ نانا کی گردن کے نیچے سے سر نکال کر اس نے بھی دیکھا۔ خاموش برساتی رات میں دور والے سگنل کی سرخ آنکھ روشن تھی۔ وہ ڈر گیا اور سر اندر کر کے چپ چاپ بیٹھ گیا۔ نانا نے کھڑکی بند

کر دی۔ وہ ان کے اور قریب سرک آیا۔

ایک دم کالی رات میں لال لال روشنی

سامنے بیٹھی اس سے ذرا بڑی عمر کی لڑکی اسکارف میں چھپے سے مسکرائی۔ وہ اس کی طرف بہت دیر سے دیکھ رہی تھی اور اس کا ڈر محسوس کر رہی تھی۔ لڑکی کو مسکراتا دیکھ کر اسے شرمندگی محسوس ہوئی۔

"ڈبل لائن ہوتی تو گاڑی ایسے ہی تھوڑے رک جاتی" نانا نے چہرے کا پانی رومال سے خشک کرتے ہوئے گویا اپنے آپ سے کہا۔

یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ گاڑی کی لائن تو ڈبل ہی ہوتی ہے۔ اکیلی پٹری پر گاڑی کے دونوں طرف کے پہیے کیسے چل سکتے ہیں بھلا۔

نانا کی طرف اس نے پوچھنے والے انداز سے دیکھا۔

مونچھوں والا اس کا سوال سمجھ گیا۔

"ایسا ہوتا ہے بیٹے کہ اگر ایک ہی پٹری پر آنے جانے والی دونوں طرف کی گاڑیاں چلتی ہیں تو اگلے اسٹیشن پر ادھر سے آنے والی گاڑی روک دیتے ہیں۔ جب ایک طرف کی گاڑی پاس ہو جاتی ہے تو دوسری طرف کی گاڑی چھوڑتے ہیں۔"

"تو ہماری گاڑی کیوں روک دی۔ ہماری گاڑی نے تو ابھی ابھی چلنا شروع کیا تھا۔" اس نے مونچھوں والے کے بجائے نانا سے سوال کیا۔

یہ بات اسکارف والی لڑکی کی سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی۔ وہ بھی بڑے میاں کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"دراصل ادھر والی گاڑی ابھی اسٹیشن پر آئی نہیں ہوگی۔" نانا نے بتایا۔

جو شخص بہت دیر سے اوپر کی برتھ پر لیٹا ایک موٹی سی پرانی کتاب پڑھ رہا تھا، بولا۔

"پٹری ایک ہے اور گاڑیاں بہت۔ اور کوئی گاڑی ابھی اسٹیشن پر نہیں پہنچی ہے۔ سب بیچ میں ہیں۔ اسی لیئے گاڑی روک دی....."

پھر وہی آدمی زور سے چلایا۔

"کون ہے جو روکتا ہے گاڑیاں؟"

اتنے حصے کے سارے مسافر منہ اٹھائے، بے تکے جملے بولنے والے اس شخص کو دیکھ رہے تھے لیکن پھر کتاب والا آدمی کچھ نہیں بولا۔

تب اس کے ذہن میں ایک بات آئی۔ اس نے نانا کا کندھا پکڑ کر بہت یقینی انداز میں کہا۔

"ہیں نانا۔ اسٹیشن بابو روکتے ہوں گے گاڑیاں۔؟"

"ہاں بیٹا۔"

وہ دل ہی دل میں خوش ہوا کہ جو بات موٹی کتاب والا نہیں جانتا وہ اسے معلوم تھی۔ اس نے بہت فخر کے ساتھ اسکارف والی لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ اس وقت اپنی چھوٹی بہن کے لیے بسکٹ کا ڈبہ کھول رہی تھی۔ معلوم نہیں اس نے سنا کہ نہیں۔"چلتی ہوئی گاڑیاں اسٹیشن بابو روکتے ہیں۔" اس نے چلا کر کہا۔

نانا، مونچھوں والا، وہ لڑکی اور سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اس نے محسوس کیا کہ اسکی آواز زور سے نکل گئی تھی۔ وہ جھینپ مٹانے کے لیے نانا کے رومال کا چوہا بنانے لگا۔ اور تب اس نے دیکھا کہ اسکارف والی لڑکی نے اپنی بہن کی آنکھ بچا کر آدھے سے زیادہ بسکٹ اپنی فراک کی جیب میں رکھ لیے ہیں۔ یہ دیکھ کر اسے ایک انجانا سا دکھ ہوا۔ اس نے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ دور بستی کی روشنیاں بارش کے پس منظر میں آڑی ترچھی متحرک کرنیں بنا بنا کر چمک رہی تھیں۔

اچانک گاڑی سے تھوڑی دور چار دیواری میں بنے مکان میں بلب روشن ہوا۔ اس روشنی میں اس نے دیکھا کہ بڑے سے مکان کے بڑے سے برآمدے میں ایک بڑی سی میز پر ایک بڑا سا کتا بڑا سا منہ پھاڑے کھڑا ہے۔

"نانا نانا۔ دیکھئے میز پر کتا کھڑا ہے۔" اس نے نانا کا کندھا ہلا کر کہا۔ نانا نے ادھر منہ کیا اور آنکھیں چندھی کر کے اس طرف دیکھا اور مسکرائے۔

آدمی

"نہیں بیٹے یہ کتا نہیں لکڑ بگھا ہے۔ ایس۔ پی صاحب نے اس خونی لکڑ بگھے کو اکیلے مارا تھا۔ میں نے اخبار میں پڑھا تھا۔ اس کی کھال میں بھوسہ بھروا کر برآمدے میں سجاوٹ کے لیے لگا رکھا ہے۔"

"لکڑ بگھا کون ہوتا ہے نانا۔؟" اسنے ڈر محسوس کیا۔

تب اسکارف والی لڑکی نے جلدی سے کہا۔ "لکڑ بگھا اصل میں بھیڑیا ہوتا ہے۔"

"بھیڑیا کون ہوتا ہے؟" اس نے پوچھا

"بھیڑیا!!! بھیڑیا!!" وہ رک گئی۔ سوچنے لگی پھر بولی۔

"بھیڑیا اور لکڑ بگھا سب ایک جیسے جانور ہوتے ہیں۔"

تب مونچھوں والے نے کہا۔

مگر یہ لکڑ بگھا ذرا الگ تھا۔ یہ ہنستا بھی تھا اور مرتے دم رویا بھی تھا۔"

"ارے" اس کے منہ سے بس اتنا ہی نکلا۔ اس نے نانا کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

تب مونچھوں والا بولا۔

"اسی لیے جب اس کی ٹرافی بنی تو کاری گر نے کمال ہی کر دیا۔ اس کا منہ پھیلا کر چیڑوں میں ایک تنکا ایسے پھنسا دیا کہ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کبھی لگتا ہے یہ ہنس رہا ہے۔ کبھی لگتا ہے منہ پھاڑے رو رہا ہے۔"

یہ سب سن کر اس کے بدن میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔

تب اوپر سے کتاب والے نے بھاری آواز میں کہا۔

"یہ ہمیشہ ہنستا ہی رہتا ہے۔ یہ ہمیشہ روتا ہی رہتا ہے۔"

اس نے پہلے تو اسکارف والی لڑکی کی طرف دیکھا پھر ہمت کر کے آہستہ آہستہ نظریں ادھر کیں اور کھڑکی کے باہر چار دیواری میں بنے مکان کے برامدے میں میز پہ کھڑے اس لکڑ بگھے کو دیکھا۔

اسے لگا جیسے وہ ہنس رہا ہے۔ اسے لگا جیسے وہ رو رہا ہے۔

اچانک کسی نے کھڑکی کے باہر سے چلا کر کہا۔

"دروازہ کھلوادو بھائی صاحب۔ آخری گاڑی ہے۔ میرا جانا بہت ضروری ہے۔ میری مدد کرو خدا کے لیے۔"

نانا نے کھڑکی کے شیشے پہ ہاتھ رکھے رکھے باہر کھڑے شخص کو دیکھا جو دھیمی روشنی کے باوجود بہت بے تاب نظر آرہا تھا۔

اس نے ہنستے روتے لکڑ بگھے کی جانب سے نگاہیں واپس کھینچیں اور دیکھا کہ دھندلے شیشوں کے پیچھے وہ آدمی بارش میں بالکل شرابور ہو چکا ہے۔ اسکے ہاتھ میں پلاسٹک کا ایک تھیلا جیسا تھا جسے بچانے کے لیے وہ جان توڑ کوشش کر رہا تھا۔

"دروازہ نہیں کھلے گا۔ اسٹیشن پر کیوں نہیں بیٹھ گیا تھا۔" مونچھوں والا گرجا۔

باہر والے نے منہ پھلا کر سانس کے زور سے پھونک مار کر بالوں اور چہرے سے بہتی پانی کی بوندوں کو دھکیلا اور ایسے چلایا جیسے ڈوبتا ہوا آدمی چلاتا ہے۔

"دروازہ کھلوادو میں سب بتادوں گا۔ جلدی کرو بھائی صاحب جلدی۔ گاڑی چل دے گی۔"

"آج کل کا کوئی ٹھیک نہیں ہے۔ معلوم نہیں کوئی چور اچکا ہو۔ دروازہ مت کھلنے دینا ڈبے کے اندر کوئی مسافر بولا تھا۔

اس نے دیکھا کہ نانا شش و پنج میں تھے۔

اب باہر والے نے تھیلا ایک ہاتھ میں پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے کھڑکی کا شیشہ پیٹنا شروع کر دیا تھا۔

"یہ مت کرو جی۔ صبح والی گاڑی سے چلے آنا۔ ڈبے میں ویسے ہی جگہ نہیں ہے۔" نانا نے چلا کر کہا۔

"دروازے میں بیٹھ جاؤں گا۔ بھائی کے لیے خون کی بوتل لے کر جارہا ہوں۔ صبح اسکا آپریشن ہے۔ نہیں پہنچا تو وہ مر جائے گا۔ جلدی کرو بابا۔ گاڑی چلنے ہی والی ہے۔"

وہ رحم طلب نظروں سے سب کی طرف دیکھ کر بولا۔

"بہروپیا ہے۔ جھوٹا ہے۔" مونچھوں والا پھر گرج کر بولا۔

اپنی گرج سے وہ باہر والے کو کم اندر والوں کو زیادہ ڈرانا چاہتا تھا۔ دراصل ڈبہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ گیلری تک میں آدمی بھرے پڑے تھے۔ دروازے کا شیشہ اور شٹر سب بند تھے۔ اسی لیے وہ دروازے سے ملی کھڑکی میں بیٹھے بڑے میاں سے رحم طلب کر رہا تھا۔ اسکارف والی لڑکی کی ماں اپنے پچھلے سفر میں ملے کسی چور کا ذکر بلند آواز میں کرنے لگی تھی۔

"میں چور نہیں ہوں۔ قسم سے میں چور نہیں ہوں۔" بارش کے شور میں اسکی آواز دب رہی تھی ابھر رہی تھی۔

نانا کے پہلو سے لگے لگے اس نے محسوس کیا کہ اس کی رگیں کھنچ رہی ہیں اور کوئی چیز سینے میں بری طرح گھٹ رہی ہے۔

"نانا۔ نانا۔ دروازہ کھلوادو۔ دیکھو اسکا بھائی مرجائے گا۔ نانا۔ میں کھول آؤں؟"

"بیٹھے رہو تم۔" نانا کے بولنے سے پہلے مونچھوں والے نے ڈپٹ کر کہا۔

اس نے سہمی سہمی نظروں سے مونچھوں والے کی طرف دیکھا پھر نانا کی طرف دیکھا جو خاموش تھے۔ پھر اسکارف والی کو دیکھا جو سب کچھ سن رہی تھی اور کچھ سوچ رہی تھی اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد کھڑکی کے باہر چار دیواری میں بنے مکان کے برآمدے میں میز پر کھڑے منہ پھاڑے لکڑ بگھے کو دیکھ لیتی تھی۔ اس کو اپنی طرف دیکھتا محسوس کر کے اسکارف والی نے اس کی طرف دیکھا۔ اس بار وہ مسکرائی نہیں تھی۔

اسکارف والی کی سوچ کو محسوس کر کے اس نے اپنے اندر ہمت محسوس کی اور سوچا کہ یہ مونچھوں والا شخص بڑا کمینہ ہے۔ یہ تو خود چور جیسا لگتا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے جب نانا نے گاڑی رکنے کی وجہ جاننے کو کہا تھا تو کیسا بہانہ ملا رہا تھا کہ باہر بارش ہے۔ کوئی نیچے تھوڑے ہی اتر کر دیکھنا تھا۔ اس کو ڈر لگ رہا تھا کہ کوئی اس کے اٹھتے ہی اس کی جگہ پر نہ بیٹھ جائے۔ کمینہ... مونچھیں ہونے پر بھی ڈرتا ہے کہ باہر والا آئے گا اور چور بن کر اسے کھا جائے گا۔ اصل میں ڈرتا ہے نہ باہر والا آئے گا تو تھوڑی جگہ گھیر لے گا اور اپنے بھیگے کپڑوں سے اسے بھگا دے گا۔ جھوٹا... مکار...

نانا جو کھڑکی کے پاس بیٹھے تھے اب کھڑکی کے شیشے سے رستے پانی میں آہستہ آہستہ بھیگنے لگے تھے۔

کھڑکی کے شیشوں پر اب باہر والے نے جنونی انداز میں ہاتھ مارنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے ہاتھ کی ضرب کی دھمک سے شیشوں پر چپکا پانی بار بار نانا کے کپڑوں پر چھلک آتا تھا۔

اچانک اس کے تھے سے ذہن میں ایک بجلی سی کوندی۔

"نانا۔ اسے دروازہ کھول کر اندر کر لو۔ اس کا بھائی مر گیا تو سب پر گناہ پڑے گا۔ اسے کھڑکی کے پاس بٹھا دینا تو تم بھی پانی سے بچ جاؤ گے۔ ہیں نانا؟"

نانا نے مونچھوں والے کا تاثر جاننے کے لیے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ مونچھوں والے کے ماتھے کی رگیں اس تجویز پر کھلنے لگی تھیں اور چڑھی ہوئی آنکھ کے انگارے ماند پڑنے لگے تھے اور آہستہ آہستہ چہرے کی سختی دور ہو رہی تھی۔

تھے سے بچے کے مدد کے جذبے کو دیکھ کر اور اپنی اپنی سیٹ محفوظ خیال کر کے سب مطمئن نظر آ رہے تھے۔ اسکارف والی کی ماں نے بھی پچھلے سفر کے چور کا قصہ درمیان میں چھوڑ دیا تھا اور نظریں نیچے کئے چھوٹی بچی کو کمبل میں لپیٹنے لگی تھیں۔ باہر والا زور سے گھگھیا کر چیخا۔

"تم سب کو اپنے اپنے بھائیوں کا واسطہ۔ دروازہ کھلوا دو۔ بتی بہری ہو گئی ہے۔ گاڑی چلنے ہی والی ہے۔"

اس نے نانا کی طرف دیکھا، تیزی سے اٹھا، مسافروں کی ٹانگوں سے الجھتا، ٹکراتا گھوم کر دروازے پر پہنچا۔ مسافر ہاں ہاں کرتے ہی رہ گئے اس نے دروازہ کھول دیا۔ باہر والا بجلی کی طرح اندر آیا اور دروازہ بند کر کے زور زور سے ہانپنے لگا۔ وہ نیلے رنگ کی قمیص پہنے ہوئے تھا جو بدن پر چپک کر رہ گئی تھی۔

"میں نے دروازہ کھولا ہے۔" اس نے نیلی قمیص والے کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھ کر کہا۔

نیلی قمیص والے نے اس کی طرف ایسے دیکھا جیسے وہ ایک ننھا سا فرشتہ ہو جو اپنے پنکھ گھر کی الماری میں بند کر آیا ہو۔

"ہمارے نانا کے پاس کھڑکی کی طرف بیٹھ جانا۔ نانا پر پانی آنے لگا ہے۔" اس نے کہا نیلی قمیص والے نے تھیلا احتیاط سے رکھ کر اپنے کپڑے اتارے۔ سردی میں تھر تھراتے کانپتے ہاتھوں سے اپنے کپڑوں کو کھڑکی کھول کر باہر نکال کر نچوڑا، پانی جھٹکا اور مونچھوں والے نے ترچھی نظر کر کے مشکوک انداز سے اس کے تھیلے کی طرف دیکھا۔ پلاسٹک کے تھیلے میں خون کی بوتلیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ اسے مایوسی ہوئی۔ وہ بڑبڑایا۔

"آخر جب سگنل ہو گئے تو گاڑی چلتی کیوں نہیں؟"

اس کا دل چاہا کہ ابھی گاڑی کچھ دیر اور کھڑی رہے۔ وہ لکڑ بگھے کو ٹھیک سے نہیں دیکھ سکا تھا۔

اسکارف والی اپنی ماں سے پوچھ رہی تھی کہ اگر منہ میں پھنسا تنکا گر جائے تو کیا پھر بھی لکڑ بگھے کا منہ ایسے ہی کھلا رہے گا۔

"معلوم نہیں۔ گاڑی کیوں رکی کھڑی ہے کم بخت۔" اس کی ماں نے اونگھتے اونگھتے آنکھیں کھول کر کہا۔

نانا نے اسے بتانا شروع کیا۔

"یہ تو نہیں معلوم کہ یہ ہنسا کیوں تھا اور رویا کیوں تھا لیکن اتنا ضرور ہے کہ اب بھی جب تیز ہوائیں چلتی ہیں اور اس کے کھلے ہوئے منہ سے ہو کر گزرتی ہیں تو ایسا لگتا ہے۔ جیسے یہ زور زور سے ہنس رہا ہے یا جیسے زور زور سے رو رہا ہے۔ پر بیٹا یہ ہے بڑا منحوس جانور۔ یہ جس دن مرا تھا اسکے دوسرے ہی دن کپتان پولیس نے اپنا تبادلہ کرا لیا تھا۔ یہ ٹرافی تو اگلے ایس۔ پی صاحب نے بنوائی تھی۔"

اچانک نانا نے نیلی قمیص والے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ذرا کھڑکی گھیر کر بیٹھو جی۔ پانی مجھے بھگوئے دے رہا ہے۔"

نانا کی اس بات نے اسے دکھ دیا۔

اچانک پوری گاڑی کی بجلی چلی گئی اور گھپ اندھیرا چھا گیا۔
اس نے سہم کر نانا کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔
مسافروں نے ریل کی بد انتظامیوں پر گفتگو کرنا شروع کر دی۔
نانا نے کھڑکی کے باہر جھانک کر دیکھا۔ گارڈ چھتری لگائے گزر رہا تھا۔
"کیا ہوا گارڈ صاحب اندھیرا۔ کیوں ہو گیا۔" نانا نے زور سے پوچھا۔
"کچھ نہیں۔ بیٹھے رہو۔ ڈائنامو کا تار نکل گیا ہے۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔"
ڈبے میں بالکل تاریکی تھی۔ بڑی مشکل سے ایک دوسرے کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔
تاریکی کے ساتھ خاموشی بھی کہیں سے در آئی تھی۔ سکوت اور اندھیرا۔ اسی لیے باہر کا منظر کچھ اور روشن اور با آواز ہو گیا تھا۔ باہر بارش کا زور ٹوٹ رہا تھا لیکن ہوا تیز ہو گئی تھی۔
نیلی قمیص والے نے کھڑکی آدھی کھول لی تھی۔ اب بوچھار نہیں آ رہی تھی۔ باہر کوئی بھاگتا ہوا آیا اور نیلی قمیص والے کا بازو پکڑ کر بولا۔
"دروازہ کھول دو بھیا۔ اسٹیشن سے بھاگتا ہوا آ رہا ہوں۔ گاڑی چھوٹ گئی تھی۔ بڑی مشکل سے مل پائی ہے۔"
اس نے نانا کا ہاتھ پکڑے پکڑے مونچھوں والے کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی سیٹ پر خود کو محفوظ سوچے مطمئن تھا اور اونگھ رہا تھا۔
اسی وقت ہوا کا ایک جھونکا ڈبے پر سے ہوتا ہوا چار دیواری میں بنے مکان کے برآمدے کی طرف گیا اور خاموش تاریک رات میں ایک ہولناک آواز ابھری۔ وہ کانپ گیا۔
نانا نے اسے لپٹاتے ہوئے سرگوشی کی۔
"دیکھو لکڑ بگھا ہنستا ہے۔ اس طرح روتا ہے۔"
اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔
لکڑ بگھا منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ ہوائیں چل رہی تھیں اور وہ ہنس رہا تھا۔ رو رہا تھا۔
برآمدے کی روشنی میں اس کے جبڑے صاف نظر آ رہے تھے جن میں نوکیلے دانت چمک

رہے تھے۔ اسے اپنے اندر سنسنی دوڑتی محسوس ہوئی۔

اسکارف والی بھی اپنی ماں سے چمٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ کھچا کھچ بھرے ڈبے میں سب خاموش تھے۔

باہر کھڑے آدمی نے نیلی قمیص والے کا شانہ زور زور سے ہلایا۔

"بھائی صاحب میری مدد کرو۔ میرے بھائی کا ایکسی ڈنٹ ہو گیا ہے۔ ابھی ابھی خبر ملی ہے۔ اس کی حالت بہت نازک ہے۔ اسپتال میں دم توڑ رہا ہے۔"

نیلی قمیص والے نے اپنے تھیلے کو مضبوطی سے سنبھالا۔ باہر کھڑے گھگھیاتے خوشامد کرتے آدمی کا ہاتھ اپنے شانے سے ہٹایا، کھڑکی کا شیشہ گرایا اور اونگھنے لگا۔

اسکارف والی زور سے چلائی۔

"امی۔ امی۔ دیکھو۔ لکڑ بگھا اب نہ ہنس رہا ہے نہ رو رہا ہے۔ ہوا کے زور سے وہ تنکا گر گیا۔ لکڑ بگھا چپ ہو گیا امی۔"

جو اتنی دیر سے سب کچھ سن رہا تھا، سب کچھ دیکھ رہا تھا، اس نے اپنے نانا کی کمر مضبوطی سے پکڑ کر نیلی قمیص والے کی آنکھوں میں دیکھا۔ نیلی قمیص والے کی آنکھیں اس کی آنکھوں سے چار ہوئیں اور ڈبے کے نیم تاریک سناٹے میں اسنے بہت واضح محسوس کیا کہ نیلی قمیص والے کی آنکھیں پہلے سے چھوٹی ہو گئی ہیں اور جبڑے آپس میں بھنچ گئے ہیں۔

○○

وہ ایک لمحہ

وہ ایک لمحہ

تھکے تھکے، بوجھل قدموں نے اس کے تھکن سے چور جسم کو گھسیٹ کر لکڑی کی بنچ تک پہونچا دیا۔ قلی نے سامان رکھ دیا اور اُس نے خود کو بنچ پر ڈھیر کر دیا۔

گھڑی دیکھی، ریل کے آنے میں ابھی پورا ایک گھنٹہ باقی تھا۔ اور یہ ایک گھنٹہ اس کے لئے بہت بڑی نعمت تھا۔ پچھلے کچھ گھنٹوں سے اسکا ذہن صرف اسی ایک گھنٹہ کا انتظار کر رہا تھا۔ ایک گھنٹہ۔ جس میں وہ اپنی سانسیں لے سکتا۔ صرف اپنے متعلق سوچ سکتا۔ اور اپنے ہی متعلق کیوں؟ ہر اُس چیز کے بارے میں کہ جسے سوچنے سے اسکے ذہن پر بوجھ نہ پڑے اور دماغ پر بار نہ ہو۔ ایک گھنٹہ، جس میں وہ اپنی موجودہ زندگی کو ذہن سے محو کر سکے اور صرف اپنے وجود کے بارے میں سوچ کر اپنی اہمیت بڑھا سکے اور دل کو تسکین دے سکے۔

کیونکہ جب ایک گھنٹہ بعد ریل آئے گی تو اسے پھر اسی جگہ پہونچا دیگی جہاں کے کونے کونے سے وہ واقف ہے مگر ذرے ذرے سے نفرت کرتا ہے۔ جہاں صرف شور ہے۔ شور... بہت شور... آدمیوں کا شور۔ عورتوں کا اور بچوں کا شور۔ جہاں ٹرافک کی دھڑ دھڑ اور ٹائپ رائٹر کی کھڑ کھڑ سے اُس کے کانوں کے پردوں میں سوراخ ہو چکے ہیں۔ جہاں انسان بھی مشینوں جیسا رویہ رکھتے ہیں۔ ہر وقت، ہر گھڑی وہی عمل کرتے ہیں جسکی اُنھیں عادت پڑ چکی ہے۔ سلام اور دعا تک مشینی انداز سے کرتے ہیں۔ خیریت پوچھتے ہی اتنی تیزی سے گذر جاتے ہیں جیسے انھیں ڈر ہو کہ جس سے خیریت پوچھی ہے وہ اگر اپنے دُکھڑے لیکر بیٹھ گیا تو وہ کیا کریں گے؟ وہاں کے چوبیس گھنٹوں میں کوئی ایک ایسا لمحہ نہیں قید کیا جا سکتا جس میں بیٹھ کر اپنے کسی عمل پر پشیمان ہوا جا سکے یا اپنے کسی کام کی دل ہی دل میں تعریف کی جا سکے یا اپنے متعلق دوسروں کے تاثرات کا اندازہ کیا جا سکے جیسا ہر عام آدمی سکون کی حالت میں کرتا ہے۔

وہ اپنے دفتر کے ایک کام کے سلسلے میں دوسرے شہر بھیجا گیا تھا۔ اس کام کے لئے خود اُسی نے اپنی خدمات پیش کی تھیں۔ ورنہ دوسرے کلرک بھی تھے جو یہ کام کر سکتے تھے اور کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اسکی خوشامد نے باس کے ہاتھوں اسکا نام منتخب کرادیا۔ دراصل وہ اس دندناتی، اُبلتی کھولتی زندگی سے کچھ دِن چرانا چاہتا تھا جہاں وہ ہر اُس احساس سے چھٹکارا پاسکے جو اُسکے شہر میں اسے چاروں طرف سے گھیرے رہتے تھے۔ اُس نے سوچا تھا کہ جتنے دن اِس شہر سے باہر رہے گا اپنے کانوں کو صرف وہی آوازیں سننے دیگا جو ٹائپ رائٹر کی کھڑ کھڑ، ٹرافک کے شور، باس کی ڈانٹ اور بیوی کی شکایتوں سے مختلف ہوں۔

لیکن جب وہ دوسرے شہر پہونچا تو اُسے یاد آیا کہ وہ بھول گیا تھا کہ سب شہر ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ ہر جگہ وہی بے سکونی اور بے چینی کی فضا ہے۔ ہر شہر میں وہی ہلچل اور وہی شور ہے جس سے بچنے کیلئے اُس نے اتنے سارے جتن کئے تھے۔ اور جب دفتر کا کام ختم کرکے فارغ ہوا تو اُسنے سوچا کہ میں بھی کتنا بھولا ہوں کہ یہاں سکون کی تلاش میں آیا۔ کیا یہاں میرے شہر کی طرح موٹروں کا شور نہیں۔ کیا یہاں کے دفتروں میں میرے شہر کے دفتروں کی طرح ٹائپ رائٹر نہیں ہیں۔ کیا یہاں کے آدمی میرے یہاں والوں کی طرح ایک دوسرے سے بیگانہ نہیں ہیں۔ ہر چیز ہر جگہ اُسے اپنے شہر کی طرح نظر آئی اور واپسی میں ریل میں بیٹھتے وقت اُسے اپنی اِس حماقت کا احساس ہوا اور ایک تپی ہوئی تلخ مسکراہٹ بے بسی کی گود سے ہمک کر اُس کے ہونٹوں پہ چپک گئی، اتنی تلخ اور اتنی تپی ہوئی مسکراہٹ کہ اُسے محسوس ہوا کہ اگر یہ مسکراہٹ کچھ دیر تک اور اُس کے لبوں میں اٹکی رہی تو اُسکے ہونٹ جل اُٹھیں گے۔

اور ریل نے لاکر اسے اِس قصباتی اسٹیشن پر ڈال دیا تھا جہاں سے اُسے اپنے شہر کے لئے گاڑی بدلنا تھی۔

"بابو، آپکا ٹکٹ لے آؤں" بوڑھے چہرے پر لگی سفید مونچھوں میں سے قلی نے اُسے آواز دی۔

"اوں... ہاں یہ لو—" وہ جیسے نیند سے جاگ پڑا ہو۔ اُس نے ٹکٹ کے دام قلی کو دئے۔